قومی زبان

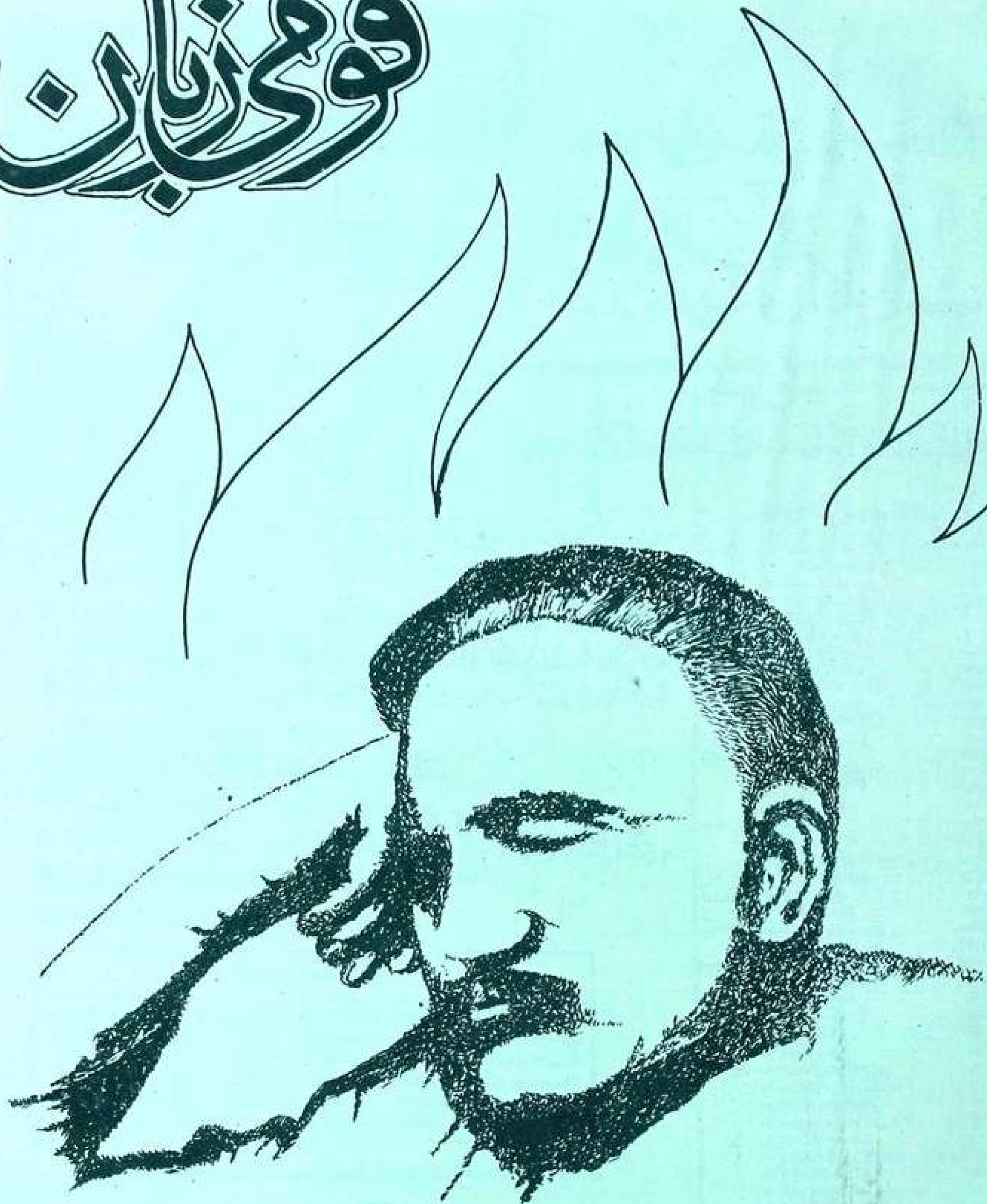

فاش گوئم بتو حرفے کہ نداند ہمہ کس

ماھنامہ

قومی زبان

کراچی

نومبر ۱۹۹۱
جلد: ۶۳
شمارہ: ۱۱

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی

ادا جعفری

ڈاکٹر اسلم فرخی

مدیر

ادیب سہیل

بدل اشتراک

فی پرچہ .....۸۰ روپے

سالانہ عام ڈاک سے ۹۰ روپے

سالانہ جسٹری سے ۱۶۲ روپے

بیرونِ ملک

فی پرچہ ..... ایک ڈالر

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ ۱۵ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ ۲۵ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان

بابائے اردو۔ روڈ، کراچی ۱، فون: ۷۷۲۴۰۲۳

شعبہ ... فون: ۴۶۱۴

مضمون نما

اداریہ	جمیل الدین عالی،	۳
اقبال کی ایک غزل کا تحقیقی جائزہ	ڈاکٹر صدیق جاوید	۷
مطالعۂ بیاض اقبال	شفیق عجمی	۱۹
علامہ اقبال اور جمہوریت	رعنا اقبال	۲۷
صبا اکبر آبادی۔ ایک باکمال شاعر	احمد ہمدانی	۳۱
ایک باغی عورت کی موت	طاہر مسعود	۳۷
شہاب الدین رحمت اللہ	ڈاکٹر وقار اشدی	۴۱
یادوں کا سفر۔ جوش ملیح آبادی	افتخار احمد عدنی	۴۷
چند خطوط	محمد سلیم الرحمٰن	۵۹
نواب آزاد کی روئیداد نویسی	کلثوم طارق برنی	۶۷
گلہائے رنگ رنگ		
ٹیکس کا مسئلہ (بنگلہ کہانی)	عبدالمبین/احمد سعدی	۷۱
نظمیں	خالد سہیل، منیر الدین احمد	۷۸
رفتارِ ادب		۸۰
گردوپیش		۸۶
نئے خزانے	ڈاکٹر وقار اشدی	۹۰
حروفِ تازہ		۹۳

جمیل الدین عالی
معتمد اعزازی

بعض اوقات دوسری آواز میں اپنی آواز ملانی بھی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ان سب ادب دوستوں کے احساسات میں جو محترمہ عصمت چغتائی کے انتقال پر لکھ رہے ہیں ان مرحومہ سے اس ناچیز طالب علم اور مداح کا خراج عقیدت بھی شامل ہے۔ اس مختصر سے مودبانہ اختلاف یا اضافے کے ساتھ کہ اردو ادب، پاک ہند ادب، عالمی ادب کا کوئی باب بند نہیں ہوا، کوئی ستون نہیں گرا۔ بس یہ دکھ کی بات ضرور ہے کہ اللہ ان کی مغفرت کرے وہ جسمانی طور پر ہم سے جدا ہو گئیں (اور وہ پاکستان میں رہتی ہی کب تھیں آئی بھی صرف دو مرتبہ تھیں) ورنہ اتنے بڑے لوگ صدیوں نہیں مرتے۔ یہ لوگ ستون نہیں ہوتے عمارتیں۔ باب نہیں کتابیں ہوتے ہیں۔ عصمت چغتائی ترقی پسند تحریک میں شامل ہونے سے پہلے ہی خود ایک "تحریک" بن چکی تھیں۔ رواں صدی کے افسانوی ادب میں ایک دم اتنی چونکا دینے والی آواز کوئی اور نہیں اٹھی۔ اتنا تنقیدی تنازع (عورت ہو یا مرد) کسی اور نے پیدا نہیں کیا۔ قدامت پسند حلقوں سے سعادت حسن منٹو کے علاوہ اتنی مذمت بھی کسی کی نہیں ہوئی ..... اور بہر حال وہ ایک بڑی رجحان ساز ادیبہ تسلیم کی جا چکی تھیں .....

مجھے یہ دیکھ کر بڑا فخر محسوس ہوا کہ ان کی رحلت پر ہمارے بعض انگریزی اخبارات میں بھی اداریے آئے ہیں۔ جرائد تو خاص نمبر اور ابواب ان سے منسوب کرتے ہی رہیں گے ..... یہ بھی ثابت ہوا کہ پاک و ہند اردو ادب میں بلا لحاظ وطن بڑی ادبی شخصیتوں کے لیے اظہار احترام اب بھی مشترک ہے۔ دونوں ملکوں کے سیاستداں تو کیا سبق لیں گے کہ وہ بنیادی طور پر ادب اور ادیب کی طویل المیعاد اثراتی اہمیت و کردار سے ہی واقف نہیں۔ (ان میں کتنوں کو معلوم ہے کہ یورپ میں اٹھارویں صدی والٹیر (VOLTAIRE) کی صدی کہلاتی ہے۔ "کون والٹیر؟ کیا کوئی ممبر اسمبلی تھا۔ کیا وہ کسی کوآپریٹو ادارے، کسی بڑے صنعتی کمپلکس، ٹاٹا، برلا، پدم پت سنگھانیا، داؤد، آدم جی، کریسنٹ، اتفاق گروپ کا مالک تھا۔ کوئی جاگیردار سیاستداں، اس کا بیٹا یا بیٹی یا داماد تھا۔ ارے کاہے کا والٹیر اور کہاں کی صدی ....." لیکن، شاید پاک ہند کے وہ دانشور جو پاک ہند میں پر امن بقائے باہمی پر واقعی مخلصانہ سوچتے ہوں۔ (گو ایسے بہت کم ہیں) اس سانحے پر ہماری قومی صحافت کے اتنے محبتانہ فوری ردعمل سے ایک امکان کو ضرور سامنے رکھیں۔ یہ امکان کہ دوسرے بڑے بڑے سیاسی عوامل کے حل کے ساتھ ساتھ جن کی وسعتیں اور پیچیدگیاں بہت ہیں اگر کبھی پاک ہند میں ایک دوسرے سے برابر کی سطح پر قربت کی حقیقی کوششیں ہوتی ہیں تو دونوں ملکوں میں مشترک احترام کے ساتھ دیکھے جانے والے ادیب اور اردو زبان ان میں ایک بڑا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یہی دیکھ لیجیئے کہ آج بھی شمالی اور وسطی ہندوستان کے مدارس میں بندے ماترم کے ساتھ قومی نغمہ گایا جاتا ہے "سارے جہاں سے اچھا ....." وہ اردو ہی میں تو ہے۔

یہ موقع اردو افسانے کے چار ہم عصر بڑوں، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کے موازنے کا نہیں۔ وہ ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا اس اظہاریے میں اتنی گنجائش بھی نہیں کہ میں ان سے ان چند دلچسپ ملاقاتوں کا احوال

سناؤں جو ۱۹۴۶ء میں ہوئیں (جب میں نے میراجی کے ساتھ اختر الایمان کے گھر پونہ میں دو ڈھائی مہینے گزارے تھے) اور ان کے ان دو دوروں کے وقت جب وہ پاکستان آئی تھیں ۱۹۷۵ء اور غالباً ۱۹۸۶ء۔ اس وقت صرف ایک ایسی بات اور بتانی ہے جو تا حال ہماری طرف کم لوگ جانتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد عصمت چغتائی کی بیشتر تخلیقات دیوناگری لپی یعنی ہندی رسم الخط میں بھی چھپ گئی تھیں (کیوں کہ ہندوستان کی قومی زبان موثر طور پر ہندی ہو چکی ہے اور وسعت آبادی کی وجہ سے مقبول ہندی کتاب لاکھوں کی تعداد میں چھپتی ہے) اس طرح ان کی تحریروں نے مسلمان معاشرے کی عورت سے بھی کہیں زیادہ پچھڑے ہوئے ہندو معاشرے کی بہت ہی مظلوم عورت کو اس معاشرے کے بہت سے وحشیانہ رسم و رواج اور مردانہ شاونیت کے خلاف مسلسل اور بڑی لڑائیوں کے لیے تیار کرنے میں ایک عہد آفریں کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے ادبی میڈیا کی محدودات کے باوجود تقسیم سے قبل ہی اردو داں شمالی ہند اور پاکستان میں ایک بڑی کامیاب معاشرتی بغاوت کی داغ بیل ڈالی جو چاروں طرف پھیل چکی تھی اور پھیلتی جاتی ہے۔ اگر وہ ہوتیں تو خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، بانو قدسیہ، جمیلہ ہاشمی، نثار عزیز بٹ، جیلانی بانو ..... بہت سی سینئر لکھنے والیاں فردوس جمال، بہت سی جونیئر لکھنے والیوں مثلاً زاہدہ حنا، رضیہ فصیح احمد، رشیدہ رضویہ اور اب فکری طور پر عصمت چغتائی سے بلند تر مانے جانی والی مگر اسی سلسلے کی ایک ان کی جونیئر معاصر قرۃ العین حیدر کی تحریریں وجود میں نہ آتیں۔

میں نے ۱۹۸۲ء میں دہلی کا پہلا ادبی دورہ کیا تو امرتا پریتم کے گھر بھی حاضری دی۔ بہت سی باتیں ہوئیں۔ وہ اس وقت سے بھی کافی پہلے پنجابی کی عظیم شاعرہ اور پنجابی نثر میں بھی ایک بڑے مقام پر فائز تسلیم کی جا چکی تھیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا میں امرتا پریتم تو ہوں ہی مگر پنجابی نثر میں عصمت چغتائی کی توسیع بھی ہوں (عصمت عمر میں ان سے خاصی سینئر تھیں) عصمت چغتائی رحلت کر گئیں۔ عصمت چغتائی زندہ باد.....

افسوس کہ ۳۰، اکتوبر کو حضرت صبا اکبر آبادی بھی رخصت ہوئے۔ جناب صبا اکبر آبادی پر کئی صفحات لکھے رکھے ہیں مگر وہ انشاءاللہ "قومی زبان" کے خاص نمبر میں جائیں گے۔ جو ان سے منسوب ہو رہا ہے۔ (غالباً جنوری میں آئے گا) پھر بھی فرض اور قرض ہے کہ ان کی کچھ خدمات کا ذکر کر دیا جائے۔ ان کا کوئی گروپ نہیں تھا، کوئی سلسلۂ شاگرداں بھی نہیں، ان کے لواحقین مشتہرین پر دباؤ ڈال کر ان خاص نمبروں کے لیے اشتہار بھی حاصل نہیں کر سکے جن کی آب و تاب نے بعض زندہ اور صبا بھائی سے نہایت جونیئر مشاہیر کو ان کی دانست میں بقائے دوام بخش رکھی ہے ..... خدا گواہ ہے کہ ان سے محفلوں میں رسمی ملاقاتوں کے علاوہ کبھی ملا ہی نہیں ایک مرتبہ دلی میں دیکھا تھا۔ غالباً ۱۹۴۲ء، ایک مرتبہ آگرے میں (غالباً ۱۹۴۴ء) پھر کبھی کبھار ریڈیو پاکستان کے ان مشاعروں میں جو چھوٹے بخاری صاحب بڑے شوق سے منعقد کراتے تھے (اور ہاں بعض اوقات بخاری مرحوم کی افسری اور میری کستری کے مابین خاصے مجادلے بھی پیش آتے تھے۔ بعد میں زیادہ تر ان کو قریب سے سنا اور دور سے دیکھا..... آخری بار ابھی پچھلے مہینے کراچی ٹی وی پر نعتیہ مشاعرے میں ساتھ ہوا تھا کرسی پر لائے گئے مگر اسٹیج کی تین چار سیڑھیاں خود طے کیں۔ میں پاس بیٹھا تھا میں نے عرض کی یہ آپ نے کیوں کیا۔ بولے میاں نعت کا مشاعرہ ہے ..... ہائے اس مطلع میں کیا مصرع آگیا تھا۔

نعت کہنا ہماری عادت ہے

سخت جہد حیات کے باوجود تصانیف کی مقدار ایک عالم حیرت میں لے جاتی ہے۔ عمر تراسی پائی۔ جاگیر دار نہ تھے۔ کام کرتے تھے۔ ہجرت کے بعد جو مصائب ایک حیات نولائی ان سے بھی گزرے۔ بچے بھی پڑھائے اور نظر آتا ہے کہ سلطان جمیل نسیم

اور تاجدار عادل (جن کو میں کسی قدر جانتا ہوں) اچھی تربیت سے بہرہ ور ہوئے ..... سب بقول کسے فرائض دنیاوی کے ساتھ ساتھ

○۔ دو ہزار صفحات سے زیادہ نثر میں ہم عصروں کے خاکے اور خود نوشت (میں بیشتر نہیں پڑھ سکا)

○۔ اسی سے زیادہ، طویل، مرثیے، بہ قید عنوان یعنی عمومی نہیں بلکہ ایک عنوان مقرر کرتے ہیں اس کی جہتیں بڑھاتے ہوئے مضامین مراثی پھیلاتے ہیں مرثیوں کے تین مجموعے "سر بہ کف، خوں ناب" اور "شہادت"

○۔ ۱۹۳۶ء میں جب وہ بائیس تیئس برس کے ہوں گے مرثیہ، علوم، منقبت کا پہلا مجموعہ "ذکر و فکر" کے عنوان سے چھپا تھا۔

○۔ جوانی میں ہی اردو کلام غالب کی تضمین کی (۱۹۳۸ء) ڈاکٹر مولانا حامد حسن قادری (صدر شعبہ اردو فارسی آگرہ، نامور مورخ و نقاد اردو نے ایک تفصیلی موازنہ کر کے اس کی ستائش کی تھی (میں تضمین کو گاہے گاہے کسی کامیاب پیوستگی کے علاوہ بجائے خود بطور صنف کوئی اہمیت نہیں دیتا مگر اس صدی کے بعض کلاسیکی مکاتبِ فکر بھی اسے ایک منفرد نوع سخن قرار دیتے رہے ہیں۔ یہ ایک زمانے میں چلن بھی تھا اور امتحان بھی ..... ہم اپنے نہیں صبا بھائی کے زمانے کی بات کر رہے ہیں۔

بر سبیل تذکرہ ..... صبا بھائی آج کے واحد معروف ادیب تھے جن کا غالب سے خونی رشتہ ثابت ہے۔ اس طرح کہ غالب کے نانا تھے خواجہ غلام حسین کمیدان (کمانڈنٹ) ان کے سگے چھوٹے بھائی خواجہ احمد حسین ( ) صبا بھائی کے نگڑ دادا تھے۔ غالب تولاولد تھے۔ ان کا خاندان ان کے چھوٹے بھائی یوسف مرزا اور غالباً ایک بہن کی اولاد سے پھیلا۔ یہ لوگ حیدر آباد دکن اور جے پور میں رہتے تھے۔ ان کی ذریت اب بھی ہوگی مگر آکا فرحت اللہ بیگ کے علاوہ اردو ادب میں زیادہ معروف نہ ہوئی۔ ہم لوہارو والے کہ غالب کے حوالے سے بھی جانے جاتے رہے۔ غالب کے سسرالی ہیں یعنی نسبی نہیں سببی رشتہ دار ..... لیکن صبا بھائی نے کبھی بھی اپنے اسباب تعارف میں غالب سے اس نسبت خاص کی دکان نہیں چمکائی۔ خود مجھے یہ بات صرف چند برس پہلے نہ جانے کسی اتفاقی گفتگو سے معلوم ہوئی ..... مگر کیا ایسی رشتہ داریوں سے ادبی میرٹ میں کوئی فرق پڑتا ہے؟ سیاسی میدان پاکستان میں تو سارا فرق ہی خونی رشتہ داری سے پڑنے لگا ہے ..... اور اب چند برسوں سے جینیات (GENETIE) کے باب میں جو نئے نئے انکشافات آئے ہیں وہ عجب عجب امکانات سامنے لائے ہیں۔

○۔ مکمل رباعیات امیر خسرو کا ترجمہ (اردو رباعی میں گو تاحال غیر مطبوعہ ہے)

○۔ تمام رباعیات غالب (گو وہ خود زیادہ نہیں) کا رباعی ترجمہ ("ہم کلام" کے نام سے شائع ہو چکا ہے)

○۔ تقریباً ایک سو رباعیات خیام کا ترجمہ، فٹز جیرالڈ سے استفادہ کے ساتھ "دست زر فشاں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ متوسلین بتاتے ہیں کہ خیام کی بارہ سو رباعیات تحقیق کے بعد جمع کی تھیں۔ مگر خیام کی بہت سی رباعیات آج بھی الحاقی کہلاتی ہیں۔ اس لیے اس موضوع پر ان کی محنت کی سند معیار صرف محققین ہی سے مل سکتی ہے۔ محنت کی داد البتہ ہم سب پر فرض ہے۔

○۔ عربی اور فارسی کے بہت سے کلاسیکی قصائد اور منظومات کے اردو ترجمے کیے۔ بیشتر غیر شائع شدہ رکھے ہیں۔

○۔ غالب کی غزلیات فارسی ترجمہ کیں۔ (صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی دو جلدوں میں سادہ نثری ترجمہ و تشریح بابر علی صاحب نے پیکجز لمیٹڈ لاہور سے شائع کرا کے بلا قیمت اہل طلب میں تقسیم کی ہے) ان سے بڑی رہنمائی ملتی ہے۔ صبا بھائی کا یہ کام بھی بڑے پیمانے پر عام ہونا چاہیے۔

○۔ حافظ کی بہت سی غزلیات کا ترجمہ .....

○۔ غزلوں کے تین مجموعے "اوراق گل" "چراغ بہار" اور "ثبات" ..... تقریباً ایک لاکھ ابیات صرف غزل میں ہی کہہ گئے ہیں۔
○۔ پچاس کے قریب ترجمے پشتو سے اردو میں کیے ایک وقت میں ان کا اور مخدومی امیر حمزہ شنواری صاحب کا ساتھ (کراچی میں) ہو گیا تھا جب شنواری صاحب حیدر آباد میں علاج کرا کے کراچی آئے تھے۔ خود شنواری صاحب نے صبا بھائی کی سو سے زیادہ غزلوں کا پشتو میں ترجمہ کیا تھا۔
اب حضرت شاہ لطیف بھٹائی، سچل سرمست کے تراجم پر کام کر رہے تھے۔

زمزمہ

قیام پاکستان سے پہلے ان خطوں کے رہنے والوں نے جن کو کسی طرح بھی پاکستان میں شامل نہیں ہونا تھا تحریک پاکستان میں جو خدمات سر انجام دیں ان کی ایک کہانی ہے جو بوجوہ فراموش کرائی جا رہی ہے۔ چلئے یہ "حقائق" ہیں بہر حال اکبر آباد (آگرہ) کا ایک نوجوان شاعر ۱۹۴۶ء جیسے زمانے میں "زمزمہ پاکستان" کے نام سے ایک مجموعہ نغمات لکھتا اور چھپواتا ہے اور یو۔ پی جیسے صوبے میں طرح طرح کے خطرے اٹھاتا ہے۔ یہ صبا اکبر آبادی تھے .....

کیا نئی نسل نے "ترانہ پاکستان" سنا ہے جسے ۱۹۴۶ء سے مسلم لیگ کے جلسوں میں گایا جانے لگا تھا۔ "پاکستان ہمارا" یہ بھی ایک لکھنوی نے لکھا تھا اس کا نام مجاز تھا۔ اسرار الحق مجاز لکھنوی کچھ کہتے ہیں یہ انھوں نے تب لکھا جب کمیونسٹ پارٹی نے قرارداد پاکستان کی حمایت میں فیصلہ دے دیا تھا (۱۹۴۵ء غالباً ۱۹۴۶ء) مگر اس وقت بھی دوسرے بڑے بڑے ترقی پسند شعراء موجود تھے ان میں کسی کا کوئی نغمہ پاکستان کی تاریخ کے ریکارڈ میں نہیں ملتا ..... بہر حال نہ اس کا انعام مجاز بھائی نے چاہا نہ صبا بھائی کو ملا۔ یہ گفتگو یونہی آ گئی ہے ..... ڈر ہے کہ کہیں بعض احباب پھر اسے کوئی "آشوب تلیری" قرار نہ دے دیں۔ اس ناچیز محض پاکستانی کا المیہ یہ بھی ہے کہ

جانتا بھی نہیں جرم تلیری کیا ہے

یہ صبا بھائی کی تصنیفات کا صرف ایک مقداری جائزہ تھا جو ایک حیرت کدہ سامنے لاتا ہے معیاری جائزہ ناقدین کا منصب ہے۔ وہ منصب اس ناچیز نے نہ اب تک حاصل کیا نہ اسے کسی نے دیا۔ (گو آج کل کچھ مشکل نہیں رہا) لیکن مقدار کی مبینہ کم قدری کے باوجود ایک بات ضرور کہہ دی جائے۔ معیار کا تعین معقول کے بغیر ہوا نہیں کرتا ایک ایک دو دو شعر کے شاعر زندہ ضرور رہ گئے ہیں سو وہ اتفاق اور ان کی قسمت لیکن ہومر، سوفوکلیز، فردوسی، رومی، انیس و دبیر، غالب، اقبال، جوش خوش مقام اسی لیے ثابت ہوئے کہ کم کلام نہ تھے ..... صبا بھائی کے دو بچے سلطان جمیل نسیم اور تاجدار عادل اپنے باپ سے ادبی ذوق کی وراثت پائے بیٹھے ہیں (جو آج کل اولاد کم وصول کرتی ہے) اگر ایک صبا اکادمی کی طرح ڈالیں تو غیر مطبوعہ کلام بھی سامنے آئے اور یہ طے ہے کہ مطبوعہ و مسموعہ بھی انھیں ایک منفرد اور بڑی حیثیت عطا کر چکا تھا۔ اللہ انھیں غریق رحمت کرے (آمین)!

ڈاکٹر صدیق جاوید

اقبال کی ایک غزل کا تحقیقی جائزہ

کسی فن پارے کی تاریخِ تخلیق اور تاریخ اشاعت اس کی تفہیم و تعبیر اور تشریح و تفسیر میں کس قدر موثر ثابت ہوتی ہے؟ اس کا ثبوت بہم پہنچانے کی ضرورت نہیں۔ تخلیق کی تاریخ کے تعین کی اہمیت کے پیشِ نظر، مغرب میں شعرا کے دواوین و کلیات کی زمانی ترتیب و تدوین ایک الگ شعبۂ تحقیق قرار پایا ہے۔ اردو میں بھی مختلف مخطوطات کی بنیاد پر کسی کتاب کے متن کے تعین کی روایت خاصی مستحکم ہو چکی ہے۔ البتہ تخلیقات کے زمانے کا تعین یعنی کسی شاعر کے کلام کی زمانی ترتیب ایک نیا تحقیقی رجحان ہے۔ اس رجحان کی ترقی نے اقبال کی شاعری اور نثر کے ابتدائی متن کے تقابلی مطالعہ اور زمانی تعین کا احساس پیدا کیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں کچھ کام تو سامنے آیا ہے اور بہت اہم کام ترتیب و تشکیل کے ابتدائی، وسطی اور آخری مرحلے میں ہے۔ زیرِ نظر مضمون اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور اس لیے اہم ہے کہ اس موضوع کا ایک پہلو محققین اقبال کی گرفت میں آتے آتے رہ جاتا ہے۔

اقبال کے ناقدین اور شارحین علامہ کی شاعری کے مختلف دور قائم کرتے ہیں۔ ان جائزہ نگاروں کے دو گروہ ہیں ان میں سے ایک گروہ بانگ درا کے تین حصوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اقبال کی شاعری کے تین ادوار قائم کر کے اقبال کے فکر و فن کا مطالعہ کرتا ہے اور دوسرا گروہ چار ادوار کے مطابق اقبال کے فکری و فنی ارتقاء کا جائزہ لیتا ہے۔ دونوں گروہوں سے متعلق کم و بیش ہر جائزہ نگار اقبال کے تتبع میں ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۵ء تک کو پہلا اور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کو دوسرا دور تسلیم کرتا ہے۔ پہلا دور گویا حصہ اول "بانگ درا"، ۴۹ نظموں اور ۱۳ غزلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی نظم رسالہ "مخزن" کے پہلے شمارہ بابت اپریل ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی آخری نظم "التجائے مسافر"، اقبال نے انگلستان جاتے ہوئے، دہلی میں رک کر، ۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کو حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر پڑھی جو بعد میں "مخزن" اکتوبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ غزلیات میں آخری غزل "مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے" "مخزن" مئی ۱۹۰۵ء میں چھپی تھی۔ اقبال نے بہت کم اپنی منظومات پر تاریخ درج کی ہے۔ تاہم اقبال کے عمومی انداز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے مجموعوں میں اکثر و بیشتر زمانی ترتیب ملحوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال کی شعری تخلیقات کا زمانی اور بعض صورتوں میں ان کا پس منظر باقیات اقبال، متروکاتِ اقبال، مکاتیب، سوانحی حالات اور اس نوع کی دوسری مدون و غیر مدون تحریروں کی مدد سے وجود میں آیا ہے جہاں تک مرتبہ کلام اقبال کا تعلق ہے اس کا بنیادی متن اور اس کی ترتیب وہی رہے گی جو اقبال نے قائم کی تھی۔ لہٰذا مرتبین باقیات اور محققین کو اقبال کے مرتبہ متن کا زمانۂ تخلیق وغیرہ طے کرنے کی کاوش کو ترجیح اور اولیت دینی چاہیے۔

مولانا غلام رسول مہر، پہلے اقبال شناس اور شارح اقبال ہیں جنھوں نے اقبال کی منظومات کے پس منظر اور تاریخ اشاعت کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی طرح ڈالی۔ یہ درست ہے کہ انھوں نے یہ کام ایک موضوع قرار دے کر نہیں کیا دراصل یہ ایک

بالواسطہ کوشش تھی۔ مہر مرحوم نے مطالب بانگ درا کے نام سے شرح لکھی تو انھوں نے تقریباً ہر نظم پر تمہیدی نوٹ لکھنے کی کوشش کی ان تمہیدی وضاحتوں کی تعداد کا اندازہ حسبِ ذیل تفصیل سے ہوسکتا ہے:

بانگ درا کے پہلے حصہ میں کل نظمیں ۴۹ ہیں اور ان میں سے ۳۵ نظموں پر تمہیدی نوٹ ہے اسی طرح اس حصے کی ۱۳ غزلیات میں سے چھ غزلوں پر نوٹ ہے۔ حصہ دوم کی ۲۴ نظموں میں سے ۹ نظموں اور سات میں سے چار غزلیات پر نوٹ ہیں۔ حصہ سوم کی کل ۷۰ منظومات میں سے تقریباً ۱۹ نظموں پر اس قسم کے تمہیدی نوٹ ہیں اور آٹھ غزلیات میں سے کسی پر بھی نوٹ نہیں ہے۔ مہر مرحوم کے اس بالواسطہ کام کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ بہ استثناء چند نظموں کے، مہر صاحب کے تمہیدی نوٹ رسالہ "مخزن" کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں۔ حصہ دوم کی غزلیات میں غزل نمبر چھ کے لیے مہر صاحب کے پاس کوئی خارجی شہادت نہ تھی مگر مہر صاحب نے تمہیدی نوٹ لکھا ہے جس کے لیے متن کی ایک داخلی شہادت کو بنیاد بنایا ہے اور سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ راقم الحروف نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ بعنوان "فکرِ اقبال کا عمرانی مطالعہ" میں غالباً پہلی بار ضمناً متذکرہ غزل نمبر چھ کے بارے میں لکھا تھا:

"..... اصولاً زیرِ نظر غزل بانگ درا حصہ اول میں شامل ہونی چاہیے تھی مگر معلوم نہیں یہ غزل اقبال نے بانگ درا حصہ دوم میں چھٹے نمبر پر کیوں درج کی ہے؟ جبکہ غزل نمبر تین اور غزل نمبر چار بالترتیب اپریل ۱۹۰۶ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھیں۔" (۱)

مولانا مہر مرحوم نے زیرِ نظر غزل کے مشہور شعر نمبر نو میں مازنی کے پانچ سطری تعارف میں لکھا ہے:

"..... یہ غزل بظاہر اس زمانے میں لکھی گئی جب اقبال ولایت سے واپس آ رہے تھے۔ مازنی والا شعر غالباً اٹلی کے میدانوں کو دیکھنے کا نتیجہ ہے۔ جہاز آبنائے سینا سے گزرتا ہے تو دائیں طرف سسلی اور بائیں طرف اٹلی کی سرزمینیں دور دور تک نظر آتی ہیں۔" (۲)

ان سطور کے مطابق اس غزل کا زمانۂ تخلیق وسط جولائی کے گرد و پیش کا کوئی ایک دن قرار پائے گا کیوں کہ ڈاکٹر جاوید اقبال کے مطابق "اقبال جولائی ۱۹۰۸ء میں انگلستان سے وطن روانہ ہوئے تاریخ کا تعین ممکن نہیں .... اقبال بمبئی سے ہوتے ہوئے ۲۵ جولائی ۱۹۰۸ء کی رات دہلی پہنچے ..... ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو دوپہر کی گاڑی سے لاہور پہنچے۔" (۳)

مولانا مہر کے علاوہ دوسرے شارحین بھی اسی غلط فہمی کا شکار رہے ہیں۔ شرح بانگ درا میں یوسف سلیم چشتی اس شعر کی تشریح میں لکھتے ہیں ..... "دوسرا مصرع "جہاز پر سے تمھیں ہم سلام کرتے ہیں" یہ بتاتا ہے کہ اقبال نے یہ غزل اس وقت لکھی جب وہ ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپس ہو رہے تھے۔" (۴) اسی طرح آقائے رازی شرح بانگ درا میں زیر تبصرہ شعر کی توضیح کے بعد لکھتے ہیں: "یہ غزل اقبال نے سفر یورپ سے واپسی پر راستہ میں لکھی تھی۔" (۵)

ان شارحین کے مندرجہ بالا بیانات اگرچہ درست نہیں مگر ان کے مغالطہ کو دو وجوہ کی بناء پر نظر انداز کیا جاسکتا ہے کیوں کہ ان حضرات کے مغالطہ کا باعث بانگ درا کی ترتیب میں وہ مقام ہے جہاں یہ غزل شائع ہوئی۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ یہ غزل بانگ درا حصہ دوم میں آخری سے پہلی غزل ہے۔ دوسرے اس بناء پر کہ معلوم ہوتا ہے ان اصحاب کے پیشِ نظر اقبال کا ۲۵ نومبر ۱۹۰۵ء کو کیمبرج سے مولوی انشاءاللہ ایڈیٹر "اخبار وطن" لاہور کے نام لکھا ہوا خط کبھی نہیں رہا جو ۲۲ دسمبر ۱۹۰۵ء کے "اخبارِ وطن" میں شائع ہوا تھا۔ یہ خط اقبال کی فراموش کردہ اور گم گشتہ تحریروں میں شامل رہا اور تقریباً ۵۶ سال بعد دریافت ہوا۔ یہ خط اول اول جزوی طور پر

رسالہ "ماہ نو" اپریل ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں مکمل خط رسالہ "اقبال" لاہور شمارہ اپریل ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ (۶) پھر سید عبدالواحد معینی نے مقالات اقبال (مئی ۱۹۶۳ء) اور گوہر نوشاہی نے مطالعہ اقبال ۱۹۷۱ء (انتخاب مجلہ اقبال لاہور) میں شامل کیا۔ اس کے بعد سے اقبال کا یہ مکتوب خطوط اقبال، مقالات یا مضامین اقبال کے مختلف مجموعوں میں برابر شائع ہو رہا ہے علاوہ ازیں اقبال پر سوانحی تحریروں، اقبال پر فنی تنقید اور اقبال کے تصور وطنیت کے حوالے سے مقالات میں اس کے اقتباسات یا اس کے حوالے برابر آ رہے ہیں۔ اس کے باوجود نئے شارح بھی وہی غلطی دہرا رہے ہیں۔ ڈاکٹر شفیق احمد اپنی "شرح بانگ درا" میں مازنی کے حوالے سے لکھتے ہیں: "..... غالباً اقبال نے یورپ سے واپسی پر اٹلی کے قریب سے گزرتے ہوئے یہ شعر کہے تھے یعنی وسط ۱۹۰۸ء میں" (۷)

طویل ترین جملہ ہائے معترضہ بر طرف، اقبال کے سفر انگلستان (۱۹۰۵ء کے تاثرات پر مبنی دو خط ایڈیٹر "اخبارِ وطن" کے نام شائع ہوئے ہیں۔ پہلا خط ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کو عدن سے اور دوسرا خط ۲۵ نومبر ۱۹۰۵ء کو کیمبرج سے لکھا گیا۔ معلوم ہوتا ہے ان دو خطوں کے درمیان میں بھی اقبال نے ایک خط لکھا ہوگا جو ابھی دریافت نہیں ہوا۔ (۸)

بہر حال ۲۵ ستمبر ۱۹۰۵ء کے خط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اقبال کی زیرِ بحث غزل کی تاریخ تخلیق ۲۰ یا ۲۱ ستمبر ۱۹۰۵ء قرار دی جا سکتی ہے۔ چونکہ یہ غزل بڑے ہی یادگار ماحول میں تخلیق ہوئی اور اس کے ارد گرد قدرت نے ایسی ASOCIATION کا تانا بانا بن دیا تھا کہ اقبال اس غزل کے زمانہ تخلیق اور موقع و محل کو شعوری طور پر بھی بھلانا چاہتے تو ان کے دائرۂ اختیار میں نہ تھا۔ اس پس منظر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے اس غزل کو بانگ درا کے دوسرے حصہ غزلیات میں آخری غزل (سات نمبر) سے پہلے درج کیوں کیا۔ درانحالیکہ زیرِ بحث غزل کے سوا کم و بیش باقی سب غزلیات ۱۹۰۶ء کی تخلیق ہیں۔ یہاں ایک اور بات بھی محلِ نظر ہے اقبال نے بانگ درا کے حصہ اول اور حصہ دوم کی بالترتیب (..... ۱۹۰۵ء) اور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء) کے سنین سے تحریر کی ہے۔ خصوصاً دوسرے حصہ میں ۱۹۰۵ء کے نمبر نے اشکال اور ابہام پیدا کر دیا ہے کیوں کہ اب تک یہی سمجھا گیا ہے کہ پہلا دور ۳۱ دسمبر ۱۹۰۵ء تک محیط ہے۔ بہر حال زیر نظر غزل کو حصہ دوم میں شامل کرنے کے ممکنہ اسباب کا مطالعہ بعد میں کریں گے مگر اس سے پہلے یہ دیکھتے چلیں کہ اقبال شناس حضرات نے زیرِ نظر غزل کے بانگ درا میں مقام اندراج کے تعین کی بابت کیا کاوش کی ہے؟ مندرجہ بالا سطور میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ شارحین اقبال چونکہ بوجوہ زیرِ نظر غزل کو ۱۹۰۸ء کی تخلیق قرار دیتے ہیں اس لیے وہ بانگ درا حصہ دوم کی غزلیات میں اس کی شمولیت پر معترض نہیں مگر وہ حضرات جن کے علم میں یہ بات ہے کہ متذکرہ غزل ستمبر ۱۹۰۵ء کی تخلیق ہے وہ کس بنیاد پر اسے حصہ دوم کا جزو گردانتے ہیں؟ خصوصاً مولوی عبداللہ قریشی صاحب نے بھی اس مسئلے پر توجہ نہیں کی حالانکہ ان کے بارے میں پورے وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اقبال کی حیات اور فن کی گمشدہ کڑیاں ملانے کی روایت کو سب سے زیادہ مستحکم کیا۔ سید عبدالواحد مرتب باقیاتِ اقبال دیباچہ طبع دوم میں لکھتے ہیں:

"..... شفیق محترم جناب محمد عبداللہ قریشی .... کو اقبالیات کے ہر شعبہ سے ایک والہانہ شغف ہے ان کو اقبالیات کے سلسلہ میں دوسری دلچسپیوں کے علاوہ علامہ کے (کا) کلام جمع کرنے کا بھی شوق ہے انھوں نے نہایت دریا دلی سے اپنی برسوں کی محنت سے جمع کیا ہوا کلام باقیات میں شامل کرنے کے لیے نذر کر دیا۔ یہی نہیں صاحب موصوف نے باقیات کی ترتیبِ نو میں اس قدر دلچسپی لی کہ بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ باقیات کا موجودہ ایڈیشن ان ہی کی مساعی جمیلہ کا مرہون احسان ہے۔" (۹)

ان دونوں اقبال شناس اصحاب کی مرتبہ باقیات میں دکن ریویو ستمبر ۱۹۰۵ء کے حوالے سے مندرجہ ذیل چھ شعر درج ہیں:

عجب تماشا ہے مجھ کافرِ محبت کا
صنم بھی سن کے جسے رام رام کرتے ہیں
ہوا جہاں میں ہے پیکار آفریں کیسی
کہاں عدم کے مسافر مقام کرتے ہیں
رہینِ لذتِ ہستی نہ ہو کہ مثلِ شرر
یہ راہ ایک نفس میں تمام کرتے ہیں
نظارا لالے کا تڑپا گیا مرے جی کو
بہار میں اسے آتش بجام کرتے ہیں
جہاں کو ہوتی ہے عبرت ہماری ہستی سے
نظامِ دہر میں ہم کچھ تو کام کرتے ہیں
نہ قدر ہو مرے اشعار کی گراں کیوں کر
پسند ان کو وزیرِ نظام کرتے ہیں(۱۰)

ان اشعار پر باقیات اقبال کے مرتبین کی طرف سے کوئی وضاحتی نوٹ نہیں لکھا گیا۔ جب کہ اکثر جگہ بانگ درا کی مشمولہ نظموں اور غزلوں کے محذوف اور متروک اشعار کی نشاندہی کی گئی ہے لیکن مندرجہ بالا شعار کے نیچے قوسین میں حوالہ جاتی الفاظ "دکن ریویو ستمبر ۱۹۰۵ء (۱۱)" کے سوا اور کچھ نہیں لکھا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے باقیات کے مرتبین بانگ درا حصہ دوم غزل نمبر ۶ سے ان اشعار کی نسبت نہیں قائم کر پائے۔

عبداللہ قریشی صاحب کا ایک مضمون بعنوان "اقبال کا تعلیمی سفر" روزنامہ "امروز" لاہور بابت ۲۶ دسمبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا(۱۲)۔ اس میں مولوی انشاء اللہ خان کے نام خطوط شامل نہیں ہیں کیوں کہ یہ خطوط اس وقت تک دریافت نہیں ہوئے تھے۔ قریشی صاحب نے اپنے تحقیقی مقالات کا مجموعہ ۱۹۸۲ء میں "حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں" کے نام سے شائع کیا تو اس میں متذکرہ مضمون (اقبال کا تعلیمی سفر) کافی ترمیم و اضافہ کے بعد شامل کیا گیا۔ اس میں خطوط بنام ایڈیٹر "اخبار وطن" لاہور بھی چند سطری تعارف اور حواشی کے ساتھ اضافہ کر دیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے دوسرے خط (محررہ ۲۵ نومبر ۱۹۰۵ء) میں زیر بحث "غیر محذوف" غزل بھی شامل ہے۔ اس غزل کے اشعار میں مندرجہ بالا پہلے پانچ اشعار موجود ہیں مگر چھٹا شعر شامل نہیں ہے۔ محولہ بالا پانچ اشعار کے متعلق قریشی صاحب نے فٹ نوٹ میں لکھا ہے:

"یہ اشعار "بانگ درا" کی ترتیب کے وقت غزل سے خارج کر دیے گئے۔"(۱۳) مگر آخری شعر (نہ قدر ہو مرے اشعار کی گراں کیوں کر) کے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ یہ نہ صرف بانگ درا میں بلکہ ۲۲ دسمبر ۱۹۰۵ء کے اخبار، وطن میں چھپنے والے خط میں بھی حذف ہے۔ یہاں یہ بات بطور خاص قابل ذکر ہے کہ راقم الحروف کی طرح صاحب موصوف اس الجھن کا شکار نہیں ہیں کہ اقبال نے یہ غزل دوسرے دور میں کن اسباب کی بناء پر شامل کی ہے اگر عبداللہ قریشی صاحب کا ذہن اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہو جاتا تو ممکن تھا کہ وہ اس کی کوئی قابل قبول توجیہہ پیش کر دیتے۔ ایسا نہ ہو سکا پھر ڈاکٹر گیان چند کی ابتدائی کلام اقبال کی ترتیب و تہذیب کے ضمن میں کوششوں کے پیش نظر توقع پیدا ہوئی تھی اقبال کی زیر بحث غزل کے حوالے سے ڈاکٹر گیان چند کی تحقیق و تدقیق کا

... پہنچنے کی سعی کرتے ہیں۔

کوئی دو سوا دو سال پہلے یعنی ۱۹۸۸ء میں ڈاکٹر گیان چند نے ایک کتاب بعنوان "ابتدائی کلامِ اقبال" (بہ ترتیب مہ و سال) شائع کی ہے۔ اس میں حواشی کے ساتھ ایسے اشعار کی نشاندہی کی گئی ہے جو اقبال نے بانگِ درا مرتب کرتے ہوئے منسوخ کر دیے تھے۔ ڈاکٹر گیان چند نے زیر بحث غزل بھی شائع کی ہے، جو ایڈیٹر "وطن" لاہور کے نام اقبال کے خط میں مندرج اشعار کے علاوہ اُن محذوف اشعار پر بھی مشتمل ہے جو باقیاتِ اقبال میں شائع کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جیسے معتبر محقق نے اپنے تعارفی حاشیہ میں قیاسی وضاحت کی ہے جس کا بالاستیعاب مطالعہ مسئلہ کو سلجھانے کی بجائے اُلجھا دیتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اقبال سفرِ یورپ کے سلسلے میں ۲۳ ستمبر ۱۹۰۵ء کو فرانس کے شہر مارسیلز پہنچے اس سے پہلے بحرِ روم میں کچھ (۱۴) دن جہاز کا سفر کیا تھا۔ ۲۱ ستمبر کے قریب اٹلی کے قریب سے گزرے ہوں گے جیسا کہ آخر سے تیسرے شعر میں اشارہ ہے اسی زمانے میں یہ غزل کہی۔ لندن سے ۲۵ نومبر کو اپنے دوست مولوی انشاءاللہ خان ایڈیٹر "وطن" کو ایک طویل خط لکھا جس میں یہ غزل شامل ہے۔ عبداللطیف اعظمی کے مطابق یہ خط اخبار وطن ۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔ (دانائے راز ص ۵۱) اس کے علاوہ یہ خطوطِ اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی ہندوستانی ایڈیشن دہلی ۱۹۷۷ء ص ۱۰۰ میں بھی شامل ہے۔

یہ غزل کچھ اشعار کے حذف کے ساتھ دکن ریویو بابت ستمبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اسے اقبال نے جلد از جلد ستمبر کے آخر میں حیدر آباد بھیجا ہوگا۔ اس زمانے میں ڈاک پانی کے جہاز سے جاتی تھی۔ اکتوبر کے آخر میں یہ خط حیدر آباد پہنچا ہوگا اور رسالے کا شمارہ نومبر میں شائع ہوا ہوگا کہ اس پر تاریخ ستمبر ۱۹۰۵ء دی ہوئی ہے۔" (۱۵)

مندرجہ بالا اقتباس کے آخری پیرا میں "بھیجا ہوگا..... پہنچا ہوگا..... ہوا ہوگا" اس بات کی دلیل ہے کہ ڈاکٹر گیان چند مسئلہ حل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے اور ان کے نہاں خانہ دل میں یہ خواہش گونجتی دکھائی دیتی ہے کہ کاش ایسا ہوا ہو۔ بہر حال قرائن و شواہد سے اس بات کا بہت کم امکان نظر آتا ہے کہ نومبر میں شائع ہونے والے رسالہ دکن ریویو کو ستمبر کا شمارہ قرار دے دیا گیا ہو۔ ربع صدی قبل تک رسائل و جرائد باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے۔ گزشتہ ماہ و سال کا تو کیا ذکر، اگر ان دنوں بھی کوئی رسالہ التواد تعویق کا شکار ہو جائے تو عموماً اس کی بابت اعتذار پیش کیا جاتا ہے۔ بہر حال ادارہ دکن ریویو کی طرف سے بعد کے کسی شمارے میں گیان چند نے ایسی کسی معذرت کی نشاندہی بھی نہیں کی بہر حال کسی قدر تامل کرنے سے اصل صورت حال کا علم ہوتا ہے۔

دراصل گیان چند صاحب نے باقیاتِ اقبال (مرتبہ سید عبدالواحد معینی، عبداللہ قریشی) دانائے راز (مرتبہ اعظمی) اور خطوطِ اقبال (مرتبہ ہاشمی) کی بنیاد پر ساری بحث کی ہے۔ جب کہ اعظمی کا ماخذ ہاشمی اور ہاشمی کا ماخذ اقبال کے مولوی انشاءاللہ خان کے نام اخبار وطن میں شائع ہونے والے وہ دو خط ہیں جو رحمان لطیف نے مجلہ اقبال لاہور ۱۹۶۲ء میں شائع کرائے تھے۔ مرتب خطوطِ اقبال نے مقالاتِ اقبال (مرتبہ سید عبدالواحد معینی) میں چھپنے والے انھیں خطوط کے متن کا مجلہ اقبال کے متن سے موازنہ کیا ہے۔ ہاشمی صاحب نے خطوط کا متن درج کرنے سے قبل تقریباً ڈیڑھ صفحہ پر محیط ان خطوط کا ایک تعارف قلمبند کیا ہے۔ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ انھوں نے اخبار وطن کے متعلقہ شماروں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ (۱۶) یہ تو کتاب کے باب نمبر ۴ بعنوان "ماخذ" کا دقت نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ انھیں اخبار وطن کے شمارے میں نہیں مل سکے۔" (۱۷) اسی طرح گیان چند صاحب کی زیر نظر غزل پر بحث سے یہ خیال گزرتا ہے کہ انھوں نے دکن ریویو کا شمارہ ستمبر ۱۹۰۵ء بچشم خود دیکھا ہے۔ اسے راقم الحروف کی بصارت اور بصیرت کی کوتاہی کہا جا سکتا ہے مگر اس سے غالب گمان یہی تھا کہ گیان چند صاحب کو حیدر آباد میں متذکرہ دکن ریویو فراہم ہو گیا ہے۔

اس کے باوجود راقم الحروف کو اطمینان نہیں ہو رہا تھا کیوں کہ کسی بھی منطق کی رو سے گیان چند صاحب کے اس بیان سے اتفاق کرنا مشکل تھا کہ اقبال نے جلد از جلد ۱۹۰۵ء میں دکن ریویو کو غزل بھیجی ہوگی ۱۳ اکتوبر کے آخر میں حیدرآباد پہنچی ہوگی۔ لہٰذا دکن ریویو کا شمارہ نومبر میں شائع ہوا ہوگا اور اس پر ستمبر ۱۹۰۵ء کی تاریخ دی ہوئی ہے۔

بہرحال راقم نے گیان چند کے بیان کو نیم دلی سے تسلیم کرتے ہوئے مندرجہ ذیل شعر:

نہ قدر ہو مرے اشعار کی گراں کیوں کر
پسند ان کو وزیرِ نظام کرتے ہیں

کی بابت کئی قیاس قائم کیے۔ یاد رہے یہ شعر ایڈیٹر وطن کے نام خط میں درج غزل میں سے حذف ہے۔ راقم کا خیال تھا کہ شاید یہ شعر دکن ریویو میں غزل کی اشاعت کا محرک ہوا ہو۔ میرے قیاس یہ تھے۔

(الف) اقبال کا اس سفر یورپ سے پہلے وزیر نظام مہاراجہ کشن پرشاد سے کوئی رابطہ رہا ہوگا۔

(ب) ممکن ہے اقبال نے مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے نام خط میں غزل ارسال کی ہو تاکہ وزیر نظام تک پہنچ جائے۔

(ج) اقبال کو کسی ذریعہ سے اپنے کلام کے بارے میں مہاراجہ کشن پرشاد کی رائے پہنچی ہو۔ یا پھر خط میں ایڈیٹر دکن ریویو کے لیے غزل لکھتے لکھتے نظام کے قافیے سے یہ شعر سوجھ گیا جو انھوں نے دکن ریویو میں غزل کی متوقع اشاعت کے پیشِ نظر مہاراجہ صاحب کے سخن شناسی اور تحسین کلام کے اعتراف کے طور پر درج کر دیا ہو۔ ہمارا یہ قیاس بھی درست ثابت نہ ہوا آئندہ صفحات کے مطالعہ سے پتہ چلے گا کہ اقبال نے دکن ریویو کو غزل ارسال کرنے کے بعد اخبار وطن کو غزل روانہ کی تھی۔

کوئی ڈیڑھ برس قبل مضمون لکھتے ہوئے اس مرحلے پر طبیعت میں سخت اُلجھن پیدا ہوئی۔ نتیجتاً مضمون یہیں رک گیا۔ اِدھر اُدھر احباب سے "دکن ریویو" کے متعلقہ فائل کی بابت استفسار شروع کیا۔ ایک عزیز دوست نے عابد رضا بیدار صاحب کے مضمون یا نوٹ کا ذکر کرتے ہوئے ایک مبہم حوالہ لکھ بھیجا۔ میں نے اشتیاق کا اظہار کرتے ہوئے انھیں مفصل حوالہ کے لیے مقامی ڈاک سے کئی خط اور زبانی پیغام بھجوائے۔ خطوط اور پیغام وصول کرنے کے باوجود انھوں نے مطلوبہ حوالہ فراہم نہ کیا۔ آخر چار ماہ انتظار کے بعد راقم نے عابد رضا بیدار صاحب کو خط لکھا انھوں نے ۲۷ اگست ۱۹۹۱ء کو اپنے مکتوب میں لکھا:

"دکن ریویو کے محولہ شمارے سے اقبال کی مطلوبہ غزل والے صفحہ کا عکس منسلک ہے۔" یہ عکس صفحہ نمبر ۲۱۰ اور ۲۱۱ پر مشتمل ہے۔ صفحہ نمبر ۲۱۰ کے شروع میں سرشار سے متعلق ایک مضمون کی اختتامی آٹھ سطریں ہیں۔ آخر میں مضمون نگار کا نام شیخ تصدق حسین لکھنوی درج ہے۔ اس کے بعد غزل کا جلی عنوان قائم کر کے اقبال کی زیر بحث غزل کے چودہ اشعار اور مندرجہ ذیل فٹ نوٹ درج ہے۔

"وطن مازنی، یعنی اٹلی جس کا ساحل اُس وقت مصنف کے سامنے تھا جب یہ شعر لکھا گیا۔"

غزل کا تسلسل صفحہ نمبر ۲۱۱ تک قائم رہتا ہے اس صفحہ پر مقطع اور اس سے پہلے یہ شعر درج ہے۔

نہ قدر ہو مرے اشعار کی گراں کیوں کر
پسند ان کو وزیرِ نظام کرتے ہیں

مقطع کے بعد دائیں ہاتھ "لندن۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء" مرقوم ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال کا نام بحیثیت شاعر کہیں درج نہیں ہے۔ صرف مقطع میں "اقبال" بطور تخلص مرقوم ہے۔ اقبال کا نام فہرست میں ضرور ہوگا مگر فہرست کا صفحہ میرے پیش نظر نہیں ہے۔

اقبال کے آخری دو شعروں کے بعد صفحہ ۲۱۱ کے بقیہ صفحہ پر "فلسفہ لباس" کے زیر عنوان مضمون کا کچھ حصہ طبع ہوا ہے۔ عابد رضا بیدار صاحب کے کسی اسسٹنٹ نے صفحہ نمبر ۲۱۰ کے عکس پر حوالہ یوں درج کیا ہے:

دکن ریویو۔ جلد سوم، ستمبر اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۰۵ء۔" اس حوالہ سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ چار مہینوں کے شمارے ایک ساتھ دسمبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئے تھے۔

عابد رضا بیدار صاحب نے دکن ریویو جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۳۸ کا ایک نوٹ بھی ٹائپ میں نقل کروا کے بھجوا دیا ہے۔ اقبال کی زیر بحث غزل ایشیا نامی جریدہ نے بلا حوالہ نقل کرلی تھی۔ متذکرہ نوٹ میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

"ہمارے دوست پروفیسر محمد اقبال بے چارے کو جناب ایڈیٹر صاحب نے زبردستی ایم اے نمبر کا قلمی معاون بنالیا کیوں کہ ان کی جس غزل

مثالِ پرتوِ تومے (طوف) جام کرتے ہیں
یہی نماز ادا صبح و شام کرتے ہیں

سے ایم اے نمبر کو زینت دی گئی ہے وہ انھوں نے اکتوبر ۱۹۰۵ء میں لندن جاتے ہوئے جہاز پر سے دکن ریویو کے لیے لکھی تھی۔ غالباً ایڈیٹر صاحب کو منظور نہ تھا کہ اس کا اعتراف کریں ان کی تمنا تھی کہ ان کے ناظرین یہ سمجھیں کہ یہ غزل پروفیسر محمد اقبال نے خاص ایشیا کے ایم اے نمبر کے لیے لکھ کر ابھی ابھی بھیجی ہے ورنہ وہ اس کو غزل سے خارج کر دیتے۔

ہرے رہو وطن مازنی کے میدانو
جہاز پر سے تمھیں ہم سلام کرتے ہیں

شیخ محمد اقبال صاحب نے اس شعر پر یہ نوٹ بھی دیا تھا:

"وطن مازنی یعنی اٹلی جس کا ساحل اس وقت مصنف کے سامنے تھا جب یہ شعر لکھا گیا۔"

(دکن ریویو، جنوری ۱۹۰۸ء) ۱۳۸

مندرجہ بالا خط کشیدہ سطر سے ایڈیٹر دکن ریویو کے مغالطہ کا پتہ چلتا ہے۔ انھیں غزل (اور شاید خط پر بھی) اقبال کی لکھی ہوئی ۶، اکتوبر ۱۹۰۵ء کی تاریخ سے خیال ہوا کہ اقبال اکتوبر ۱۹۰۵ء میں جہاز پر سوار تھے۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال نے مدیر دکن ریویو کو خط بھی ارسال کیا تھا اگر وہ ضائع نہیں ہوگیا تو ممکن ہے کسی وقت منصۂ شہود پر آجائے۔ اقبال کے مکاتیب کے حوالے سے تحقیق کرنے والے اہل علم محولہ بالا نوعیت کے امکانات اور اشارات سے ایسے خطوط اقبال کے اعداد و شمار جمع کر سکتے ہیں جن کے قلم بند کیے جانے کا تو سراغ ملتا ہے مگر وہ تاحال سامنے نہیں آئے۔ مثلاً کیمبرج سے ۲۵ نومبر ۱۹۰۵ء والے خط میں اقبال یا نیز وطن کو لکھتے ہیں:

"کل ایک پرائیوٹ خط آپ کو لکھا تھا۔ دونوں خط آپ کو ایک ہی وقت میں ملیں گے۔" (۱۸)

یہ گزارش طرف، دکن ریویو کے متذکرہ حقائق کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر قیاسی تحقیق (جس کا نمونہ گیان چند صاحب کی زیرِ نظر غرض سے متعلق بحث ہے) کو بروئے کار لانا ہی پڑ جائے تو اس میں منطقی جواز ضرور ہونا چاہیے۔ اسی طرح ہمارے ہاں کے محققین اور مرتبین کو حقائق، واقعات اور تاریخیں وغیرہ نقل کرتے ہوئے احتیاط اور تدقیق سے کام لینا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ کتابت کی غلطی ایک بہت بڑا الاؤنس ہے مگر اس سے حتی الامکان فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے کیوں کہ خاص طور پر ایک عام قاری

مطبوعہ نقنہ کو بہت ہی معتبر اور مستند جانتا ہے۔

آخر میں ایک سوال جواب طلب رہ جاتا ہے کہ اقبال نے ٦ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو دکن ریویو کو غزل ارسال کرتے ہوئے "وزیر نظام" والا شعر تو درج کر دیا مگر ۲۵ نومبر ۱۹۰۵ء کو ایڈیٹر وطن کے نام خط میں جو غزل لکھی اُس میں سے صرف محولہ بالا شعر حذف کر دیا۔ اس عمل حذف کے محرکات اور اسباب کا سراغ لگانے کی کوشش کی جائے تو ممکن ہے سوانح اقبال میں کسی نئے پہلو کا اضافہ ہو سکے۔ یہ سوال شاید بہت ساختہ سا معلوم ہو۔ علاوہ ازیں ۲۲ دسمبر ۱۹۰۵ء کے اخبار وطن لاہور میں طبع شدہ غزل اور دکن ریویو جلد سوم۔ ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۰۵ء کے شمارے میں شائع شدہ غزل کے اشعار کی ترتیب میں فرق ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے دونوں بار یادداشت سے اشعار قلم بند کیے ہیں ممکن ہے مولوی انشاءاللہ خان کو لکھتے وقت "وزیر نظام" والا شعر یاد نہ رہا ہو یا اس مرحلہ پر ان کے نزدیک کچھ زیادہ موزوں نہ رہا ہو۔ ڈاکٹر گیان چند نے یہ شعر حذف کرنے کے امکان پر غور کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"شاید (اقبال کو) وزیر کی مدح سرائی پر حجاب آیا ہو۔" (۱۹)

اگر اقبال نے یہ شعر بھی حذف کر دیا تو کوئی عجب نہیں۔ آخر اقبال نے اتنا کلام حذف کیا کہ باقیات اقبال، سرود رفتہ اور رخت سفر جیسے مجموعے مرتب ہو گئے۔ اب یہاں دکن ریویو میں مطبوعہ غزل کو اسی ترتیبِ اشعار کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے کیوں کہ ایڈیٹر وطن کے نام خط میں درج غزل متذکرہ بالا مختلف کتابوں میں بہ آسانی دستیاب ہو جاتی ہے۔ یہ قارئین کی دلچسپی پر منحصر ہے اگر وہ چاہیں تو مقابلہ اور موازنہ کر سکتے ہیں۔ غزل ملاحظہ فرمائیے، جو عابد رضا بیدار صاحب کی فراہم کردہ فوٹو کاپی کے مطابق نقل کی جا رہی ہے۔

مثال پرتوِن طوف جام کرتے ہیں
یہی شمار ادا صبح و شام کرتے ہیں
ہوا جہاں کی ہے پیکار آفریں کیسی
کہاں عدم کے مسافر مقام کرتے ہیں
نیا جہان کوئی ڈھونڈیے کہ یہاں
ستم کشِ تپشِ ناتمام کرتے ہیں
خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں
بھلی ہے ہم نفسو اس چمن میں خاموشی
کہ خوشنواؤں کو پابندِ دام کرتے ہیں
غرض نشاط ہے شغلِ شراب سے جن کی
حلال چیز کو گویا حرام کرتے ہیں
رہینِ لذتِ ہستی نہ ہو کہ مثلِ شرار
یہ راہ ایک نفس میں تمام کرتے ہیں
بھلا نبھے گی تری ہم سے کیوں کر اے واعظ
کہ ہم تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں

ہرے رہو وطنِ مازنی کے میدانو
جہاز پر سے تمھیں ہم سلام کرتے ہیں
نظارہ لالے کا تڑپا گیا مرے دل کو
بہار میں اے آتش بجام کرتے ہیں
الٰہی سحر ہے پیرانِ خرقہ پوش میں کیا
کہ اک نظر سے جوانوں کو رام کرتے ہیں
میں اُن کی محفلِ عشرت سے کانپ جاتا ہوں
جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں
جہاں کو ہوتی ہے عبرت ہماری پستی سے
نظامِ دہر میں ہم کچھ تو کام کرتے ہیں
نہ قدر ہو مرے اشعار کی گراں کیوں کر
پسند ان کو وزیرِ نظام کرتے ہیں
جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بُلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

گزشتہ چند برس سے اقبال کی باقیات اور متروکات کے ضمن میں پی ایچ ڈی کی سطح پر باقاعدہ تحقیقی کام ہو رہا تھا جس سے باقیات و متروکاتِ اقبال کے مسائل کے حل کا پہلو روشن ہوا تھا۔ اس کام کی تکمیل کوئی ایک آدھ برس قبل ہوئی ہے لہٰذا "باقیات شعر اقبال کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" کے موضوع پر صابر کلوروی صاحب کو پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی ہے۔ انھوں نے اس مقالہ کے باب سوم میں "بانگ درا کی غزلوں کے متروکہ اشعار" کے زیر عنوان لکھا ہے:

"بانگ درا کی دور اول کی بیس غزلیات میں اشارا غزلوں میں سے بعض اشعار منسوخ کر دیے ہیں ..... ان غزلوں کے متروکات کی تفصیل درج ذیل ہے" ..... (۲۰)

حقیقت یہ ہے کہ دور اول کا بہرہ غزلیات صرف تیرہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ معلوم نہیں فاضل مقالہ نگار نے کس بنیاد پر بانگ درا حصہ دوم کی ساتوں غزلیں دور اول میں شمار کرلی ہیں۔ ان ہی سات غزلوں میں چھٹے نمبر پر زیر نظر غزل (مثال پر توے) بھی شامل ہے ازاں بعد مقالہ نگار نے "بانگ درا میں شامل (۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۸ء) کی غزلوں کے متروکات" (۲۱) کا ذکر کیا ہے۔ زیر نظر غزل کے متروکات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مثال پر توے طوف جام کرتے ہیں۔ سرود (رفتہ) ص ۲۴۲، ۴۴۳ باقیات (اقبال) ص ۳۵۱، ابتدائی کلام (اقبال) ص ۲۸۹، اصل غزل سولہ اشعار پر مشتمل تھی۔ دس اشعار بانگ درا میں شامل ہوئے ہیں۔ گیان چند نے غزل کے اشعار کو صحیح ترتیب سے درج نہیں کیا۔ متروک اشعار کی ترتیب یہ تھی۔

ہوا جہاں کی (۴)، عجب فسانہ ہے (۵)، نظارہ لالہ کا (۶)، لذت ہستی (۱۲)، جہاں کو ہوتی ہے (۱۳)، نہ قدر ہو (۱۵)۔

بیاض اعجاز میں متروکہ شعر (نمبر ۵) عجیب فسانہ ہے۔ ایم میں لفظ "فسانہ" ہے جب کہ باقیات اور ابتدائی کلام میں "تماشا"

درج ہے۔ تماشا سننے کی نہیں دیکھنے کی چیز ہے لہٰذا یہاں لفظ فسانہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ متروکہ اشعار میں سے پانچ "سرود رفتہ" میں موجود ہیں۔ ایک زائد شعر "باقیات" میں موجود ہے۔ اس اعتبار سے اس غزل کے متروکہ اشعار کی تعداد چھ ہو جاتی ہے۔" (۲۲)

ڈاکٹر صابر کلوروی کا گیان چند پر اعتراض قابل فہم نہیں ہے کیوں کہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انھوں نے غزل کے کس متن کے پیش نظر گیان چند کی ترتیب اشعار کو صحیح تسلیم نہیں کیا۔ ڈاکٹر کلوروی نے زیرِ نظر غزل کے ماخذ کے سلسلے میں دکن ریویو ستمبر ۱۹۰۵ء، وطن اخبار نومبر ۱۹۰۵ء، کلیات (رزاق) بیاض اعجاز۔

ابتدائی کلام اقبال (گیان چند) سرود (رفتہ) اور باقیات (اقبال) کا نام لیا ہے۔ گزشتہ صفحات میں پیش کیے گئے مختلف حوالوں کے پیش نظر یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ فاضل محقق نے دکن ریویو اور اخبار وطن ملاحظہ نہیں فرمائے یاد رہے زیر نظر غزل کیمرج سے اقبال کے مرقومہ خط ۲۵ نومبر ۱۹۰۵ء میں درج تھی اور یہ خط اخبار وطن لاہور کی اشاعت نمبر ۴۹، جلد ۵ مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا تھا۔ (۲۳) واقعہ یہ ہے کہ مولوی انشا اللہ خان ایڈیٹر وطن لاہور کے نام جو دو خط (دوسرے خط میں زیرِ نظر غزل شامل ہے) نقل در نقل ہو رہے ہیں اُن کا متن درج ذیل فٹ نوٹ کے مطابق رحمان لطیف کا فراہم کردہ ہے۔ دکن ریویو ستمبر ۱۹۰۵ء کا حوالہ جو عام ہوا ہے وہ باقیات اقبال اور سرود رفتہ کا مرہون منت ہے۔ اگر ان دونوں مجموعوں کے مرتبین کے پیش نظر دکن ریویو کا متذکرہ شمارہ تھا تو بعض لفظی اختلافات اور خصوصاً سرود رفتہ میں "وزیر نظام" والا شعر نظر انداز کرنے کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔

متذکرہ معروضات کی روشنی میں اس امر کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ باقیات اقبال (اشاعت بار سوم ۱۹۷۸ء) اور سرود رفتہ میں دکن ریویو ستمبر کو ماخذ قرار دے کر زیر نظر غزل کے جو متروک اشعار دیے گئے ہیں ان کی داخلی شہادتوں یعنی بعض اشعار میں لفظوں کے فرق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اشعار دکن ریویو سے نقل نہیں کیے گئے۔ دکن ریویو میں شائع شدہ غزل جس کی فوٹو کاپی جناب عابد رضا بیدار نے فراہم کی ہے اوپر درج کی جا چکی ہے اس کے ساتھ باقیات اقبال اور سرود رفتہ میں زیرِ نظر غزل کے متروکہ اشعار کا موازنہ کیا جا سکتا ہے۔

حواشی:-

۱- "فکر اقبال کا عمرانی مطالعہ" ۱۹۸۷ء غیر مطبوعہ، مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور ص ۵۱۸

۲- غلام رسول مہر، مطالب بانگ درا۔ کتاب منزل لاہور، س ن ص ۱۵۵، نوٹ کتابت کی غلطی سے آبنائے مینا کی جگہ آبنائے سینا ہو گیا (ص۔ ج)

۳- جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود، حیات اقبال کا تشکیلی دور لاہور ص ۱۳۷

۴- یوسف سلیم چشتی، شرح بانگ درا، لاہور، س ن ص ۲۴۹

۵- آقائے رازی، شرح بانگ درا، لاہور، س ن ص ۲۷۵

۶- پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے تاریخ اشاعت ۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء بتائی ہے جو درست نہیں۔ "خطوط اقبال" لاہور ۱۹۷۶ء ص ۹۳۔ ہاشمی صاحب کی یہ غلطی (جو ممکن ہے کتابت کے باعث ہوا) بعض معتبر محققین نے بھی دہرائی ہے جیسے ڈاکٹر گیان چند نے اپنی کتاب "ابتدائی کلام اقبال" کے صفحہ ۲۹۰ پر رفیع الدین ہاشمی اور عبداللطیف اعظمی کے حوالہ سے ۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء ہی تاریخ بتائی ہے (اعظمی کا ماخذ "خطوط اقبال مرتبہ ہاشمی ہے)۔ اسی طرح سید مظفر حسین برنی نے بھی اپنی مرتبہ کلیات اقبال، اُردو اکادمی دہلی۔ نومبر ۱۹۸۹ء کے صفحہ ۱۱۰ پر رفیع الدین ہاشمی کے الفاظ میں ۲۲۔ دسمبر ۱۹۰۶ء ہی تاریخ درج کی ہے۔ دراصل یہ غلطی ہاشمی صاحب کی غیر سائنسی تدوین کاری کے باعث برقرار رہی ہے انھوں نے خطوط اقبال کی اشاعت کے چھ سال بعد اپنا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ "تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ" شائع کیا تو انھوں نے اپنی مرتبہ "خطوط اقبال" کی اغلاط کی بھی نشاندہی کی مگر ان میں زیر بحث غلطی کا ذکر نہیں ہے۔ وہ خود "خطوط اقبال" کے متن کی تیرہ غلطیاں بتانے کے بعد لکھتے ہیں۔ "ممکن ہے، ان میں سے بعض کتابت

کی اغلاط ہوں، تاہم مرتب کی ذمہ داری کم نہیں ہوتی۔ مقدمہ، حواشی اور توضیحی شذرات میں بھی کئی غلطیاں نظر آتی ہیں۔ (تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ ص ۲۵۵) اس کے بعد تقریباً سترہ مثالیں دی ہیں۔ اسی کتاب کے آخر میں صفحہ ۵۰۴ پر ضروری تصحیح کے زیرِ عنوان اپنے تحقیقی مقالہ کی اغلاط کی نشاندہی کی ہے۔ یہاں بھی زیرِ بحث غلطی کی اصلاح کی گنجائش تھی۔ ہاشمی صاحب کے مطبوعہ تحقیقی مقالہ اور گیان چند کی کتاب "ابتدائی کلام اقبال" کی کتابیات میں زندہ رود (ڈاکٹر جاوید اقبال) سرگزشت اقبال (ڈاکٹر عبدالسلام خورشید) شامل ہیں۔ دونوں میں ہی اقبال کے زیرِ بحث خط کی اشاعت ۲۲ دسمبر ۱۹۰۵ء بتائی گئی۔ دیکھئے زندہ رود تشکیلی دور ص ۱۵۴۔ سرگزشت اقبال ص ۵۶۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ خطوط اقبال مرتبہ ہاشمی کے باب نمبر ۴ بعنوان ماخذ صفحہ ۳۱۱ پر تاریخ اشاعت ۲۲ دسمبر ۱۹۰۵ء ہی درج ہے۔ خود گیان چند اپنی محولہ کتاب کے صفحہ ۴۳۳ پر لکھتے ہیں۔ "یہ خط ۲۲ دسمبر ۱۹۰۵ء کو شائع ہوا۔"

۷۔ بحوالہ مطالعہ اقبال ناشر بزم اقبال لاہور ۱۹۷۱ء ص ۴۸۸

۸۔ ڈاکٹر شفیق احمد، شرح بانگ درا، پاپولر پبلشنگ ہاؤس لاہور ۱۹۹۰ء ص ۱۹۳

۹۔ دیکھئے، مطالعہ اقبال ص ۴۸۳، مقالات اقبال ص ۷۵ خطوط اقبال ص ۹۳

۱۰۔ باقیات اقبال (طبع سوم) آئینہ ادب لاہور ۱۹۷۸ء ص ۱۵

۱۱۔ ایضاً ص ۴۵۱ نوٹ: ان اشعار کے متن کا تقابلی مطالعہ نہیں کیا یوں ایک اور بحث سے اجتناب کیا گیا ہے۔

۱۲۔ ۱۹۰۵ء میں ۵ کا ہندسہ واضح نہیں ہے۔

۱۳۔ حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں۔ محمد عبداللہ قریشی، بزم اقبال لاہور۔ مئی ۱۹۸۲ء ص ۲۳۹

۱۴۔ محمد عبداللہ قریشی "حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں" بزم اقبال لاہور ۱۹۸۲ء ص ۲۰۱۔ ۲۰۰

۱۵۔ اقبال نے خط میں لکھا ہے "بحر روم میں مارسیلز تک پہنچنے میں چھ روز صرف ہوئے" مقالات اقبال ۱۹۶۳ء ص ۸۲

۱۶۔ ڈاکٹر گیان چند، ابتدائی کلام اقبال اُردو ریسرچ سینٹر، حیدر آباد (آندھرا پردیش) ۱۹۸۸ء ص ۲۹۰

۱۷۔ خطوط اقبال ص ۷۵۔ ۷۶

۱۸۔ ایضاً ص ۳۱۲ (نوٹ:۔ یہاں یہ سوال غور طلب ہے کہ ہاشمی صاحب نے مقالات اقبال میں شائع شدہ ایڈیٹر اخبار وطن کے نام خطوط کا متن کیوں اختیار کیا اور اُس پر رحمان لطیف کے متن کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے فٹ نوٹ ایزاد کیے جب کہ ہر قرینہ سے عیاں ہے کہ مقالات اقبال کا ماخذ بلا حوالہ رحمان لطیف کا فراہم کردہ متن ہے۔ ہاشمی صاحب مقالات اقبال میں شامل خطوط کے جس متن کو اختلافی سمجھتے ہیں وہ دراصل کتابت اور پروف ریڈنگ کی اغلاط ہیں۔)

۱۹۔ مقالات اقبال، شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور، مئی ۱۹۶۳ء ص ۶۷

۲۰۔ گیان چند، ابتدائی کلام اقبال، محولہ بالا ۴۳۳

۲۱۔ صابر کلوروی "باقیات اقبال کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" (غیر مطبوعہ) مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور ص ۱۵۶

۲۲۔ ایضاً ص ۱۶۱

۲۳۔ رحمان لطیف، مجلہ اقبال اپریل ۱۹۶۲ء بحوالہ مطالعہ اقبال، بزم اقبال لاہور، جون ۱۹۷۱ء ص ۴۸۸

غالب آشفتہ نوا

مصنف

ڈاکٹر آفتاب احمد

قیمت: ..... ۵۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

شفیق عجمی

مطالعۂ بیاض اقبال

اقبال نے اپنی زندگی میں باقاعدہ طور پر کبھی ڈائیری نہیں لکھی اور نہ انھیں کبھی اپنی یادداشتوں کو مرتب کرنے کی مہلت ہی مل سکی۔ وگرنہ ان کی زندگی کے بہت سے گوشے جواب تک محققین کی نظروں سے اوجھل ہیں یا جن کے بارے میں ان پر تحقیق کرنے والوں میں بھی ابہام پایا جاتا ہے بہت واضح طور پر سامنے آسکتے تھے۔

البتہ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے چند ماہ تک اپنے افکار و خیالات کو شذروں یا مختصر اقوال کی صورت میں قلمبند کرنے کی کوشش کی جو انگریزی زبان میں ہیں اور جنھیں پہلے اقبال نے STRAY THOUGHTS اور بعد میں THOUGHTS قلم زد کر کے STRAY REFLECTIONS کا نام دیا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کی کوششوں کے نتیجے میں اقبال کے یہ فلسفیانہ خیالات ۱۹۶۱ء میں "STRAY REFLECTIONS" کے عنوان سے ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوئے جسے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے "شذراتِ فکرِ اقبال" کے عنوان سے اُردو میں ترجمہ کیا اور اس پر ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس کتاب کے تعارف میں لکھا: "یہ بیاض اقبال کے کاغذات میں اب تک پڑی تھی۔ بیاض سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے ۲۷ اپریل ۱۹۱۰ء کو اس میں لکھنا شروع کیا تھا! کئی ماہ تک یہ سلسلہ جاری رکھا اور پھر نہ جانے کیوں ختم کر دیا۔" (۱)

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس تعارف میں آگے چل کر لکھا ہے کہ یہ ان متفرق تحریروں پر مشتمل ہے جو اس زمانے میں زیر مطالعہ کتب کے تاثرات یا اپنے ماحول کے بارے میں ان کے خیالات و احساسات اور ایامِ علمی کی یادوں پر مبنی ہیں۔ (۲)

گویا ایک طرح سے اس بیاض کو اقبال کا حاصلِ مطالعہ بھی کہا جاسکتا ہے اور قیام یورپ کے دوران انھوں نے اپنے مشاہدات سے جو نتائج اخذ کیے اور جو موضوعات ان کے زیرِ غور رہے ان کو بھی احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش اس بیاض میں ہمیں نظر آتی ہے۔

"شذراتِ فکرِ اقبال" میں کل ۱۲۵ عنوانات کے تحت منتشر خیالات کو بیان کیا گیا ہے جن پر ایک نظر ڈالنے سے موضوعات کے تنوع اور رنگا رنگی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد ریاض کی تحقیق کے مطابق اقبال ۱۹۱۷ء میں ۳۶ یادداشتیں لکھنؤ کے رسالہ (NEW ERA) کے تین مختلف شماروں (اپریل تا اگست) میں شائع کروائی تھیں ان ۳۶ یادداشتوں میں سے ۲۹ کتاب "STRAY REFLECTIONS" اور اس کے اردو ترجمے

میں موجود ہیں۔ (۳)

بقیہ سات یادداشتوں کو کتاب میں شامل نہ کرنے کی وجہ غالباً اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ چونکہ دوسری یادداشتوں کے ساتھ وہ پہلے ہی شائع ہو چکی تھیں اس لیے اقبال نے ان کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے بیاض کی ترتیب میں شامل نہ کیا۔ ڈاکٹر ریاض بھی اپنے مضمون میں لکھ چکے ہیں کہ "ایک نوٹ یا یادداشت "حضرت رسالتمآب کا ادبی تبصرہ" کے عنوان سے اقبال نے "ستارۂ صبح" نام کے رسالے میں ۱۹۱۷ء میں شائع کروایا تھا۔ "مقالات اقبال" (لاہور) اور "اقبال کے نثری افکار" (دہلی) وغیرہ مجموعوں میں موجود ہے ... باقی چھ شذرات سید عبدالواحد معینی مرحوم کے مرتبہ انگریزی مجموعے "THOUGHTS AND REFLECTIONS OF IQBAL" (طبع ثانی ۱۹۷۲ء) کے صفحات پر موجود ہے۔" (۴)

کتاب میں بقیہ شذرات کو شامل کرنے سے متعلق ڈاکٹر صاحب کا یہ نکتہ قابل توجہ ضرور ہے کہ "ان چھ شذروں کا انعکاس اقبالیاتی ادب میں تقریباً مفقود ہے یا یہ کہ راقم الحروف کی نظر سے نہ گزرا ہو حالانکہ ان موضوعات پر قلم اٹھانے والے ایسے معنی خیز شذروں سے استناد و استشہاد کر سکتے تھے۔ (۵)

کتاب میں شامل نہ کیے جانے والے شذرات کے عنوان درج ذیل ہیں:۔

(۱) اسلام اور تصوف، (۲) اسلامی جمہوریت، (۳) شعرِ اکبر میں ہیگل کا جدلیاتی فلسفہ، (۴) نقشے اور مولانا جلال الدین رومی، (۵) شعر نظیری اور مقابلہ یا فرار۔ ان عنوان پر نظر ڈالنے سے ہمارا یہ شک دور ہو جاتا ہے کہ اقبال نے ان پر کچھ متنازعہ یا متضاد امور پر اپنے خیالات کا اظہار کیے جانے کے سبب ان کو شامل کتاب نہیں کیا اس لیے کہ یہ وہ موضوعات ہیں جن سے اقبال کو خاص دلچسپی ہے اور جن پر بعد میں انھوں نے تفصیل سے اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔

بہر حال ہمارے پیش نظر وہ ۱۲۵ شذرات ہیں جو کتاب کا حصہ ہیں اور جن میں سے ہر ایک کے لیے ایک الگ عنوان قائم کیا گیا ہے۔

شذرات میں بیان کیے گئے خیالات سے پہلے ہمیں مختصر طور پر ان حالات کا بھی جائزہ لے لینا چاہیے جو اقبال کے فکر و ذہن پر اثر انداز ہوئے اور ان شذرات کے اظہار کا باعث بنے۔

تین سالہ قیام یورپ کے دوران اقبال کی فکر و سوچ میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جہاں انھوں نے مغربی زندگی کے کچھ پہلوؤں کو سراہا وہیں اس کے کھوکھلے پن کو محسوس کرتے ہوئے اس کے مستقبل کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کیا۔ تصور وطنیت کی ہولناکیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اسے انسانیت کے حق میں زہر قاتل قرار دیا۔ یہی نہیں بلکہ سرمایہ داری کی چیرہ دستیوں اور مشینوں کی حکومت کے غلبے تلے انسانیت کو سسکتے ہوئے محسوس کیا۔

یورپ سے واپسی پر انھوں نے عالم اسلام کی زبوں حالی پر غور کیا اور خاص طور پر مسلمانان برصغیر کی سیاسی جدوجہد کے لیے عملی اقدامات کی ضرورت محسوس کی۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پورا دور اقبال کی زندگی میں جذباتی ہیجان کا دور ہے لیکن اقبال کی مکمل شخصیت اور ان کے علمی و فکری کارناموں کا بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہی ان کے ذہنی ارتقاء کا اہم ترین دور ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ان کے قلب و ذہن کو تلاش حق کی راہ میں بڑی کٹھن آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ اسی دور میں اقبال نے ارتقائے فرد اور بقائے قوم کے اسرار و رموز پر غور کیا اور وہ فکری بنیادیں فراہم کیں جن پر آئندہ سیاست ملی اور فلسفہ خودی و بے خودی کی عمارتیں استوار ہوئیں۔" (۶)

یہ ٹھیک ہے کہ ان شذرات میں فکر اقبال کی کسی مربوط متسلسل شکل کی جستجو مناسب نہیں لیکن ان ہی خیالات میں بعض ایسے نکتے بھی مل جاتے ہیں جو اقبال کے فکری ارتقاء کے سفر میں اہم موڑ ثابت ہوئے۔

اقبال نے اس بیاض میں مشرق و مغرب کے جن عظیم حکمأ و شعراء کا ذکر کیا ہے ان میں حافظ. بیدل، افلاطون، ورڈز ورتھ، مِلٹن، نطشے، گوئٹے اور کئی دوسری معروف شخصیات شامل ہیں۔

ان شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے اقبال نے ناقدانہ انداز اختیار کیا ہے محض ذہنی مناسبت یا اظہار پسندیدگی ہی نہیں ملتا، تحسین و توصیف کے ساتھ ان کے بعض خیالات پر گرفت بھی نظر آتی ہے۔

یہ وہ شخصیات ہیں جن کے ساتھ اقبال کی کسی نہ کسی صورت میں ذہنی وابستگی عمر بھر قائم رہی اور ان کی دوسری تصانیف میں بھی ان کا ذکر اور ان کے خیالات کسی نہ کسی حوالے سے موجود ہیں۔

اقبال ابتداء میں حافظ کے اندازِ بیان سے متاثر تھے اور اس کا اثر ان کی شاعری پر بھی محسوس طور پر پڑا۔ شذرات میں بھی حافظ کا ذکر اس کی اسی خوبی کے حوالے سے ہوا۔

"ترشے ہوئے ہیروں جیسے آب دار لفظوں میں حافظ نے بلبل کی غیر شعوری روحانیت کی مٹھاس بھر دی ہے۔"

(شذرہ ۱۱۹)

لیکن فکری طور پر وہ حافظ کی عین ضد ہیں اور

"مثنوی اسرار خودی" میں افلاطون کے ساتھ ساتھ "حافظ صہبا گسار" کو بھی انھوں نے اس کے حیات گریز اور بے عمل فلسفہ پر مطعون کیا ہے۔

اقبال غالب کے حکیمانہ اندازِ فکر کے قائل اور اس کے اندازِ بیان کے مداح ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ غالب، میر کے اتنے قریب نہیں ہیں جتنے اقبال غالب کے قریب ہیں۔ ۱۹۰۱ء میں غالب پر لکھی گئی ایک نظم کی ابتداء اقبال اس طرح کرتے ہیں۔

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

شذرات میں غالب کا ذکر اس کی آفاقی حیثیت کے حوالے سے کیا ہے۔

"میری رائے میں مرزا غالب کا فارسی کلام شاید مسلمانانِ ہند کی جانب سے وہ واحد پیشکش ہے جس سے ملت کے عام ادبی سرمائے میں کوئی مستقل اضافہ ہوا ہے۔ غالب یقیناً ان شعراء میں سے ہیں جن کا ذہن اور تخیل انھیں مذہب اور قومیت کے تنگ حدود سے بالاتر مقام عطا کرتا ہے۔ غالب شناسی کا حق ادا ہونا بھی باقی ہے۔" (شذرہ ۳۳)

مشرقی اور مغربی شعراء کے تقابلی مطالعے میں غالب کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ہیگل، گوئٹے، مرزا غالب، عبدالقادر بیدل اور ورڈز ورتھ سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ ہیگل اور گوئٹے نے اشیاء کی باطنی حقیقت تک پہنچنے میں میری رہنمائی کی۔ بیدل اور غالب نے مجھے یہ سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو لینے کے باوجود اپنے جذبے اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھوں، اور ورڈز ورتھ نے طالب علمی کے زمانے میں مجھے دہریت سے بچا لیا۔" (شذرہ ۲۶)

شذرات میں جس شخصیت کا ذکر اقبال نے بار بار کیا ہے اور جس سے وہ سب سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں وہ جرمنی کا مشہور مفکر شاعر گوئٹے ہے۔

جس شذرے کا پہلے حوالہ دیا جا چکا ہے اس میں بھی اقبال نے گوئٹے کا شمار ان مفکرین میں کیا ہے جن سے انھوں نے اشیاء کی باطنی حقیقت تک پہنچنا سیکھا ہے۔

ڈاکٹر صدیق شبلی نے اقبال کی گوئٹے سے ذہنی قربت کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے:

"اقبال نے یوں تو بہت سے مفکرین کے ساتھ ہمسفری اختیار کی ہے لیکن کچھ دور ان کے ساتھ چل کر انھوں نے اپنا راستہ الگ کر لیا۔ جتنا کوئی انھیں پسند آیا، اس کی انھوں نے اتنی ہی توصیف کی۔ ایک زمانے میں وہ ہیگل کے نظام سے بہت مرعوب تھے لیکن ایک وقت آیا کہ انھیں ہیگل کا صدف گہر سے خالی نظر آیا... برگساں سے اقبال کی ہم آہنگی اپنی جگہ لیکن زناری برگساں ہونا انھیں پسند نہیں کیوں کہ اس میں خودی کھونی پڑتی ہے۔ نطشے کا دل مومن مگر دماغ کافر ہے۔ کارل مارکس کلیم بے تجلی اور مسیح بے صلیب لیکن مغرب میں ایک گوئٹے ہے جس کی اقبال نے ہمیشہ تعریف ہی کی ہے اور یہ تعریف "پیام مشرق" میں تو اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔" (۷)

گوئٹے کے ساتھ اپنائیت کا اوّلین سبب بے شک اس کا شاعرانہ کمال ہی تھا لیکن اس کی مدح کی بڑی وجہ اس کی اسلامی تعلیمات کی توصیف ہے۔ ایک مغربی ہونے کے باوجود اس تعصب سے مبرا ہونا ہی اقبال کے نزدیک گوئٹے کی سب سے بڑی خوبی تھی جو اکثر مغربی اذہان کا خاصہ ہے۔

ڈاکٹر شبلی اس کے اسی پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"گوئٹے کی لائبریری واقع وائی مار میں آج بھی قرآن مجید کے متعدد نسخے اور تراجم قرآن سے اس کے لگاؤ کا ثبوت ہیں۔ اس کے کلام میں اسلامی تعلیمات کی گونج صاف سنائی دیتی ہے.... اپنے دیوان میں اس نے خدا کی وحدانیت اس کے حضور تسلیم و رضا اور ایک پیغمبر کی شفاعت پر بہت زور دیا ہے۔ اسلام کے بارے میں دیوان میں ایک جگہ گوئٹے لکھتا ہے:

IF ISLAM MEANS SUBMISSION TO GOD

WE ALL LIVE AND DIE IN ISLAM DOMINION

گوئٹے کا دیوان اسلام اور اسلامی تعلیمات کے ذکر سے بھرا پڑا ہے۔ دیوان کے اسی پہلو کی بناء پر گوئٹے کو یہ لکھنا پڑا کہ کوئی شخص اس دیوان کو پڑھ کر مجھ پر مسلمان ہونے کا شبہ کرے تو وہ اپنے اس شبے میں حق بجانب ہوگا۔" (۸)

گوئٹے کے بارے میں آٹھ شذرات بیاض میں شامل ہیں لیکن "اکتشاف" کے عنوان سے بیاض کے آغاز ہی میں (دوسرا شذرہ) اقبال نے گوئٹے کو جس انداز میں خراج عقیدت پیش کیا ہے اس کے بعد کسی اور مثال کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ شذرے کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں:

"جب کسی عظیم ذہن سے ہمارا رابطہ قائم ہوتا ہے تو ہماری روح اپنا اکتشاف کر لیتی ہے۔ گوئٹے کے تخیل کی بے کرانی سے آشنا ہونے کے بعد مجھ پر اپنے تخیل کی تنگ دامنی منکشف ہو گئی ہے"۔ (شذرہ ۲)

شذرات میں مشرق و مغرب کی جن اہم شخصیات کو علامہ نے اپنے خیالات کا موضوع بنایا ہے ان کے ذکر کے بعد اب مختصراً ان خیالات کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے جو عمر بھر ان کے زیر غور رہے۔

"اس بیاض میں ان اہم ترین تصورات و خیالات کے ابتدائی نقوش بھی ہیں جو بعد میں شاعرانہ کلام اور فلسفیانہ تصانیف میں بہ کمال اہتمام و آب و تاب پیش کیے گئے ہیں۔" (۹)

شذرات میں جن اہم موضوعات پر انھوں نے اظہارِ خیال کیا ہے ان میں فن و ادب، فلسفہ و شعر، قوت و عمل، وطن پرستی، جمہوریت اور سامراج، فطرت پسندی اور شخصیت کی بقا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اقبال کے نظریۂ فن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اس ضمن میں ان کی مقصدیت پسندی پر خاص زور دیا جاتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے نزدیک فن و ادب بھی زندگی سے الگ کوئی مقصودِ بالذات حیثیت نہیں رکھتے بلکہ زندگی کو آگے بڑھانے کے عمل میں اہم ذرائع ہیں۔

جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہُنر کیا

لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی درست نہیں ہوگا کہ وہ فن کو مقصدیت پر قربان کر دینا چاہتے ہیں۔

"اقبال کی شاعری گواہ ہے کہ فن سے ان کا گہرا رابطہ استوار رہا۔ زندگی کے اس دور میں جب کہ ان کا ذہن پوری طرح ایک اعلیٰ نصب العین کی گرفت میں آ چکا تھا وہ جن مسائل پر مسلسل غور کرتے رہے، ان میں فن کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہے۔ (۱۰)

کم و بیش شذرات میں مختصر زاویوں سے فن یا ارباب فن کا ذکر آیا ہے۔ اپنے اشعار میں تو وہ زیادہ تر فن کی مقصدیت پر زور دیتے ہیں لیکن یہاں فن اور فنکار کی عظمت، آداب فن اور اسلوب فن پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ (۱۱)

مثلاً ایک شذرے میں لکھتے ہیں:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اور روح ارضی باہم مدِ مقابل ہیں کیوں کہ جو کچھ یہ چھپاتی ہے اُسے وہ ظاہر کر دیتا ہے۔" (شذرہ ۷۷)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"شاعری میں ایک حد تک اخفا و ابہام کا عنصر پسند کرتا ہوں کیوں کہ مبہم اور مخفی پیرایہ جذباتی اعتبار سے عمیق و غائر معلوم ہوتا ہے۔" (شذرہ ۷۷)

"سائنس، فلسفہ، مذہب، ان سب کی حدیں معین ہیں۔ صرف فن ہی لامحدود ہے۔" (شذرہ ۱۲۳)

اقبال کی فکر کا مرکز و محور ان کا نظریہ خودی جس کے مدھم نقوش بعض شذرات میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس وقت تک انھوں نے خودی کے لیے (PERSONALITY) کا لفظ استعمال کیا ہے۔

"انسان کی شخصیت کو ایک دائرہ فرض کیجیئے اور یوں سمجھیے کہ قوتوں کی ایک خاص ترتیب کے نتیجے میں ایک معین دائرہ تشکیل پاتا ہے اور ان کی ترتیب میں خلل پیدا ہونے سے وہ دائرہ مٹ جاتا ہے۔"

اسی شذرے میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"شخصیت انسان کا عزیز ترین سرمایہ ہے لہٰذا اس کو خیر مطلق قرار دینا چاہیے اور اپنے تمام اعمال کی قدر و قیمت کو اسی معیار پر پرکھنا چاہیے خوب وہ ہے جو شخصیت کے احساس کو بیدار رکھے اور ناخوب وہ ہے جو شخصیت کو دبانے اور بالآخر اسے ختم کر دینے کی طرف مائل ہو۔" (شذرہ ۱۵)

قیام یورپ کے دوران انھوں نے مغربی تہذیب کے بعض ہولناک پہلوؤں کا بھی مشاہدہ کیا جن میں سے وطن پرستی کو وہ سب سے خطرناک قرار دیتے ہیں اور اتحادِ امت کے راستے میں اسے ایک بڑی رکاوٹ خیال کرتے ہیں۔ اپنے اشعار میں انھوں نے بار بار تورانی و افغانی کے امتیاز کو ختم کرنے پر زور دیا ہے۔ شذرات میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اسلام ظہوریت پرستی کے خلاف ایک احتجاج کی حیثیت رکھتا ہے۔ وطن پرستی بھی بت پرستی کی ایک نازک صورت ہے ... اسلام کسی صورت میں بت پرستی کو گوارا نہیں کر سکتا۔ بت پرستی کی تمام اقسام کے خلاف احتجاج کرنا ہمارا ابدی نصب العین ہے۔ اسلام جس چیز کو مٹانے کے لیے آیا تھا اسے مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کا بنیادی اصول قرار نہیں دیا جا سکتا۔" (شذرہ ۱۹)

شذرات میں بیشتر مقامات پر انھوں نے اس مسئلہ پر اپنے نتائجِ فکر کو پیش کیا ہے۔

اقبال قوت کے شیدائی ہیں لیکن جیسا کہ کچھ لوگوں نے اسے نٹشے کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے مناسب رویہ نہیں ہے۔ وہ قوتِ عمل کو جہدِ حیات میں ایک اہم حیثیت دیتے ہیں۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

عزم و ہمت اور قوت و عمل کے بارے میں ان کے خیالات کئی شذرات میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

"قوت میں صداقت سے زیادہ الوہیت ہے۔ خدا قوی ہے تو بھی اپنے آسمانی باپ کی طرح قوی ہو جا۔" (شذرہ ۶۳)

"قوی انسان ماحول تخلیق کرتا ہے۔ کمزوروں کو ماحول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا پڑتا ہے۔" (شذرہ ۶۴)

"قوت باطل کو چھو لیتی تو باطل حق میں بدل جاتا ہے۔" (شذرہ ۶۵)

علامہ نے مشرقی و مغربی فلسفے کا غائر مطالعہ کیا تھا لیکن وہ محض عقلی موشگافیوں میں الجھ کر رہ جانے کو کارِ بیکار سمجھتے ہیں۔

یا مُردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو حرفِ فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

فلسفہ و فکر کے بارے میں علامہ کے خیالات اور تقابلی مطالعے ہمیں شذرات میں بھی ملتے ہیں:

"تفکر بغیر عمل موت" (شذرہ ۸۲)

"فلسفہ حق کی منطق ہے اور تاریخ طاقت کی منطق لیکن موخر منطق کے احکام و احوال مقدم کے احکام و احوال سے زیادہ معقول ہوتے ہیں۔" (شذرہ ۲۴)

"فلسفہ انسانی عقل کی خنک تیرگی میں ٹھٹھرتے ہوئے تجربات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ شاعر آتا ہے اور اپنے سوزِ دل سے انھیں گرما کر واقعیت میں بدل دیتا ہے۔" (شذرہ ۹۶)

"فلسفہ بوڑھا بنا دیتا ہے، شاعری تجدید شباب کرتی ہے۔" (شذرہ ۱۱۱)

"میں نے اکثر دانائی سے آنکھ مچولی کھیلی ہے اُسے ہمیشہ عزم کی چٹان کے پیچھے چھپتے پایا۔" (شذرہ ۱۲۱)

شذراتِ اقبال علامہ کے وہ افکار پریشاں ہیں جو ان کی زندگی کے ایک اہم دور میں ان کے حاصل مطالعہ اور نتائجِ فکر کو پیش کرتے ہیں ان شذرات میں علامہ نے بعض ایسے موضوعات پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے جو بعد میں ان کی فکر کے بنیادی تصورات ثابت ہوئے۔

حواشی

۱۔ تعارف۔ شذراتِ فکر اقبال

۲۔ ایضاً

۳۔ شذرات فکر اقبال: چھ اضافی نکتے۔ مطبوعہ ماہنامہ اظہار، کراچی۔ مارچ۔ اپریل ۱۹۸۱ء

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً

۶۔ مقدمہ: شذراتِ فکرِ اقبال

۷۔ اقبال اور گوئیٹے: سہ ماہی علم کی دستک اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۸۴ء

۸۔ ایضاً

۹۔ تعارف: شذرات فکرِ اقبال

۱۰۔ مقدمہ: شذرات فکر اقبال

۱۱۔ ایضاً

حرفِ چند

از

جمیل الدّین عالی

قیمت: ستّر روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ، کراچی ۱

رعنا اقبال

علامہ اقبال اور جمہوریت

علامہ اقبال ایک ایسے شاعر، فلسفی اور دانشور ہیں جنھوں نے بیک وقت زندگی کے مختلف شعبوں کو متاثر کیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے یعنی ان کا وسیلہ اظہار شاعری تھا لیکن ان کے افکار و خیالات محض شاعرانہ نہیں ہیں اور نہ یہ صرف شاعری کی دنیا تک محدود ہیں وہ تاریخ، سیاسیات الہیات، اقتصادیات، فلسفہ اور دیگر کئی مضامین و موضوعات پر عبور رکھتے تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسوی صدی کے اوائل میں دنیا جن تبدیلیوں اور نشیب و فراز سے دوچار ہوئی اس پر ان کی گہری نگاہ تھی ان کا ذہن جدید و قدیم کا قائل نہ ہونے کے باوجود ماضی حال اور مستقبل تینوں زمانوں پر محیط تھا۔ انھوں نے اپنے عہد کے تمام اہم مسائل اور واقعات پر کسی نہ کسی عنوان سے اظہار خیال کیا ہے لیکن اپنے عہد کے حالات کو وہ مجرد یا معلق صورت میں نہیں دیکھتے بلکہ اسے ماضی سے مربوط کر کے دیکھتے اور مستقبل میں اس کی ممکنہ صورت کو بھی نگاہ میں رکھتے ہیں۔

انسانی معاشرے میں نظام حکومت کی بحث ایک اہم اور قدیم بحث ہے جس پر افلاطون سے پروفیسر لاسکی تک بہت سے مفکرین اور دانشور اظہار خیال کرتے رہے ہیں۔ انسانی تمدن کی تاریخ میں مختلف نظام ہائے حکومت کے تجربے کیے گئے ہیں جن میں ملوکیت، آمریت، اشتراکیت اور جمہوریت کے تجربے خاص طور پر اہم اور قابل ذکر ہیں۔ بیسویں صدی میں جمہوری نظام سب سے زیادہ مقبول نظام سمجھا جاتا ہے۔ جو اقوام جمہوری نظام کے تحت زندگی بسر کر رہی ہیں وہ بھی اس کی دلدادہ ہیں اور وہ اقوام بھی جو کسی اور طرز حکومت کے تحت زیست کر رہی ہیں وہ بھی جمہوریت کی دلدادہ اور پرستار ہیں اور ہر قیمت پر اسے اپنانا چاہتی ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جمہوری نظام حکومت کی کوئی ایک معین اور مقرر صورت نہیں ہے لیکن بحیثیت مجموعی اس کی یہی تعریف کی جاتی ہے کہ یہ عوام کے ذریعے قائم کی جانے والی عوام کی حکومت ہوتی ہے جو عوام ہی کے لیے ہوتی ہے۔ اس کی بنیاد رائے دہندگی کے اصول پر قائم ہے جس میں کثرتِ رائے کو آخری اور فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے۔

علامہ اقبال نے جمہوریت اور جمہوری نظام حکومت کے بارے میں جا بجا اظہار خیال کیا ہے ان کے خیالات عام اور مروجہ خیالات سے مختلف ہی نہیں بلکہ اس کے بالکل برعکس ہیں جس کی بناء پر ان کے یہ خیالات متنازعہ سمجھے جاتے ہیں لیکن یہ معاملہ اتنا سہل نہیں ہے۔ اقبال ایک باخبر اور صاحب نظر شاعر تھے۔ اس لیے ان کے افکار و خیالات پر بہت سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اقبال نے نظام حکومت اور جمہوریت سے متعلق متعدد مقامات پر بالواسطہ یا بلاواسطہ انداز میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اس سلسلے میں بانگِ درا کی طویل نظم خضر راہ کے ذیلی عنوان سلطنت کے تحت کہی گئی نظم اور ضرب کلیم کی مختصر نظم جمہوریت اس موضوع پر براہِ راست اظہار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آخرالذکر نظم کا مندرجہ ذیل شعر اس ضمن میں سب سے زیادہ مشہور اور سب سے زیادہ وجہ نزاع ہے۔

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں

بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اس شعر کا مفہوم بہت واضح ہے یعنی یہ کہ اقبال نظامِ حکومت کے سلسلے میں تعداد کی اہمیت کے نہیں بلکہ انسانی صفات کے قائل ہیں۔ بیسویں صدی کے بیشتر مفکرین اور دانشوروں نے اقبال کی اس فکر کو تنقید کا ہدف بنایا ہے لیکن اس کو ہدفِ تنقید بنانے سے پہلے ہمیں دو نکات یا سوالات پر غور کرنا چاہیے۔ اول یہ کہ کیا عددی اکثریت ہی کو واقعی سب سے زیادہ پسندیدہ، قطعی اور حتمی اصول قرار دیا جاسکتا ہے اور تعداد کے مقابلے میں جوہر یا صفت کی اہمیت کم ہے؟ دوم یہ کہ جمہوریت پر اعتراض سے قطع نظر اقبال نے اس کے مقابلے میں کسی نظامِ حکومت کی حمایت کی ہے؟ اگر غور کیا جائے تو جمہوریت میں اکثریت کا نظریہ بھی اپنے آخری تجزیے میں ایک وہم یا مفروضہ قرار پاتا ہے۔ کیوں کہ بہت سے رائے دہندگان رائے دہی کے عمل میں سرے سے حصہ ہی نہیں لیتے۔ پھر جو لوگ اس میں حصہ لیتے ہیں ان کے ووٹ مختلف امیدواروں کے درمیان اس طرح تقسیم ہو جاتے ہیں کہ بعض اوقات کل ووٹ کا صرف دس پندرہ یا بیس فیصد ووٹ حاصل کرنے والا امیدوار کامیاب قرار پاتا ہے۔ پھر اس حقیقت کو بھی جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ انسان حیاتیاتی اعتبار سے یکساں ہونے کے باوجود اپنی اہمیت اور کارکردگی کی بناء پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے کیا کوئی صحیح الدماغ آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ فٹ پاتھ پر پڑا ہوا منشیات کا عادی ایک شخص اور کوئی سائنسداں یا دانشور دونوں برابر اہمیت کے مالک ہیں؟ جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ اقبال جمہوریت پر معترض ضرور ہیں یعنی وہ اس کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن سرے سے اسے مسترد نہیں کرتے اس کے لیے ہمیں ملوکیت، آمریت اور اشتراکیت کے بارے میں ان کے خیالات کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ یہ امر بہت واضح ہے کہ مذکورہ بالا تینوں نظام ہائے حکومت کو اقبال نے پوری قوت سے رد کر دیا ہے۔ سلطنت کے زیرِ عنوان اقبال نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیرازنوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طِبِّ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

ان اشعار کو ان کے تاریخی پس منظر سے الگ کر کے صحیح طور پر نہیں سمجھا جاسکتا۔ خضرِ راہ ۱۹۲۲ء میں لکھی گئی۔ اس سے پہلے ۱۹۱۹ء میں ہندوستان میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ منظور ہو چکا تھا اور ۱۹۲۱ء میں ڈیوک آف کینٹ نے ہندوستان آکر شاہ برطانیہ کی طرف سے یہ اعلان کیا تھا کہ "سالہا سال سے بلکہ چند نسلوں سے ہمدردانِ ملک اور وفادار ہندوستانی اپنی مادرِ ہند کے لیے سوراج کا خواب دیکھ رہے تھے آج میری سلطنت میں آپ کے لیے سوراج کی ابتداء ہو رہی ہے اور آپ کو ترقی کے وسیع ترین اور اعلیٰ درجے کے مواقع مل رہے ہیں۔ تاکہ ہندوستان کو بھی میری نوآبادیات کی مانند آزادی حاصل ہو۔"

اس اعلان سے وہ لوگ تو خوش ہوئے جن کی نظریں ظاہر بیں تھیں اور جو صرف ظاہری سطح کو ہی دیکھ سکتے تھے لیکن اہل بصیرت نے اسے بھی حکمرانوں کی ایک پُر فریب حکمتِ عملی قرار دیا۔ اقبال ایسے لوگوں میں پیش پیش تھے۔ نظامِ حکومت یا طرزِ حکومت کی بحث کے سلسلے میں "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" بھی ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ جس میں ابلیس کا دوسرا مشیر یہ

سوال کرتا ہے کہ

خیر ہے سلطانیٔ جمہور کا غوغا کہ شر؟
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر

اس کے جواب میں پہلا مشیر کہتا ہے کہ۔

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگیر
کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

اقبال ملوکیت کو نہ صرف یہ کہ ناپسندیدہ بلکہ قابل نفرت سمجھتے ہیں اور وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ مغربی جمہوریت بھی ملوکیت ہی کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے اس نظام کے تحت بھی ظلم، بربریت، ناانصافی اور حق تلفی کا وہی سلسلہ جاری ہے جو عہد ملوکیت میں جاری تھا۔ اقبال کو جمہوری نظام کا یکسر مخالف یا جمہوریت کا صریح دشمن قرار نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ جمہوریت حریت اور عوامی بہبود کی دعویدار ہے اور اقبال بھی انسانی حریت، اخوت اور مساوات کے علمبردار ہیں۔ ان کی انسان دوستی میں کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ انسانی شرف و عظمت کے جس حد تک علمبردار ہیں اس حد تک ان کا کوئی ہم عصر علمبردار نظر نہیں آتا۔ انسانوں کے درمیان رنگ نسل زبان اور جغرافیہ کی بنیاد پر تفریق کو وہ لائق ملامت سمجھتے ہیں۔

اقبال در حقیقت ظاہر سے زیادہ باطن جسم سے زیادہ روح اور ذات سے زیادہ جوہر کی اہمیت کے قائل ہیں۔ اسی لیے وہ نظامِ حکومت کو اس کی ہیئتِ ترکیبی کی روشنی میں نہیں دیکھتے بلکہ انسانی نقطۂ نظر سے اس کے مقاصد، کارکردگی اور نتائج کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ اقبال ملوکیت، آمریت اور اشتراکیت کو یکسر رد کر دیتے ہیں لیکن جمہوریت کو بھی وہ تمام خامیوں سے مبرا اور مثالی طرزِ حکومت نہیں سمجھتے اس لیے اس کی خامیوں اور کوتاہیوں کی طرف بار بار توجہ مبذول کراتے ہیں۔ اس میں دو باتوں کا اضافہ اور کیا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ اقبال کے ہاں ایک رجحان ہیرو پرستی کا بھی پایا جاتا ہے اس لیے وہ سیاسی قائدین اور عوامی نمائندوں کو بھی پُر قوت اور باکردار دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ فاشزم کے رجحان سے مختلف چیز ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ کسی بھی نظامِ حکومت، آئین یا اسمبلی کو تمام حدود و قیود سے آزاد یا بالاتر نہیں کرتے۔ ان کے ہاں ہر عمل یا طریقہ خدا پرستی اور خدا ترسی سے مشروط ہے یہ بات تو اس عہد کا ہر صاحبِ فہم انسان تسلیم کرتا ہے کہ غیر مشروط اور بے محابا آزادی اپنا کوئی مطلق وجود نہیں رکھتی اور اگر رکھتی ہے تو یہ انسانی معاشرے اور تمدن کے لیے سود مند نہیں ہو سکتی۔ اقبال نے دراصل اسی خیال یا تصور کو اپنے نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ حکمراں یا حکمرانوں کا ایک خاص حد میں رہنا ضروری ہے ورنہ مغربی جمہوری ممالک میں پارلیمنٹ کو مقتدرِ اعلیٰ سمجھتے ہوئے بعض ایسے قوانین وضع کیے گئے ہیں جنھیں انسانی سماج، انسان اور تمدن کے لیے کسی طرح مفید قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مثال کے طور

پر مرد اور عورت کے جنسی عمل کی نمائش اور امرد پرستی کے حق کے قوانین۔

مختصر یہ کہ جمہوریت اور جمہوری نظام پر اقبال نے جو اعتراضات کیے ہیں وہ بھی خالص انسانی اور جمہوری نقطۂ نظر سے کیے گئے ہیں۔ یہ نکتہ بہت اہم ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے محض ادھر اُدھر سے یا سرسری طور پر نظر ڈالنے سے اقبال کی فکر اور اس کے مضمرات پوری طرح روشن نہیں ہو سکتے۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا؟

علامہ اقبال کی شخصیت اور فن پر لکھی جانے والی پہلی کتاب

اقبال

مصنفہ: احمد دین (مصنف سرگذشتِ الفاظ)

مرتبہ: مشفق خواجہ

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۳ء میں طبع ہوئی تھی اور اس ایڈیشن کے تمام نسخے جلا دیے گئے تھے۔ دوسری مرتبہ یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں ترمیموں اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ نئے ایڈیشن میں متن ۱۹۲۶ء کے ایڈیشن پر مبنی ہے اور ۱۹۲۳ء کے ایڈیشن کے تمام حذف شدہ مباحث اور اختلافات کو کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

کتاب کے شروع میں مرتب نے طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں احمد دین کے حالاتِ زندگی ادبی کاموں اور علامہ اقبال سے تعلقات کی تفصیل پیش کی گئی ہے

صفحات: ۵۲۸ قیمت: ۸۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

احمد ہمدانی

صبا اکبر آبادی ایک باکمال شاعر۔ ایک منفرد شخصیت

صبا اکبر آبادی صرف ایک شاعر ہی نہیں تھے بلکہ برصغیر کی مسلم تہذیب کا ایک جیتا جاگتا نمونہ بھی تھے۔ وہ بلاشبہ ایک مکمل شاعر تھے۔ مکمل شاعر اس لیے تھے کہ یہ ایک مکمل انسان تھے اور مکمل انسان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کا اپنے ماضی اور حال دونوں سے رشتہ مضبوط ہو اور اس کے علاوہ اس کا رخ مستقبل کی طرف بھی رہے۔ یہ رویّہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب آدمی اپنی روایت سے پیوستہ ہو، روایت سے پیوستہ رہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آدمی صرف لکیر کا فقیر بن کر رہ جائے اس کے برعکس روایت کا تو تقاضا ہی زندگی کے دوش بدوش آگے بڑھنا اور نئی نئی راہیں تلاش کرنا ہے۔ جدّت یا ندرت روایت کی ضد نہیں بلکہ روایت کی توسیع کا عمل ہے۔ مسلم معاشروں میں روایت کے جامد ہونے کا کوئی تصور نہیں ہے اس حقیقت کی وضاحت غالب نے بڑے خوبصورت اور محکم انداز سے کیا ہے۔

بامن میاویز اے پدر فرزند آذر را مگر
ہرکس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نہ کرد

"دینِ بزرگاں خوش نہ کرد" کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ بزرگوں کو مسترد کر دیا جائے اور انہیں روایات کی جڑ بنیاد اکھاڑ کر پھینک دی جائے۔ یہاں "خوش نہ کرد" کا تعلق ان رسم و رواج اور ان تہذیبی مظاہر سے ہے جنھیں بزرگوں نے اپنے حالات کی مطابقت میں اختیار کیا تھا لہٰذا حالات بدل جانے کی صورت میں ان کا بدل جانا کوئی غیر منطقی بات نہیں ہے البتہ رسم و رواج کے پس پشت تہذیبی و معاشرتی روایت کا جو جوہر کارفرما ہے اس کو بدلنا مناسب نہیں ہے۔ روایت کے جوہر کے نکتہ کو ایک مثال سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ آپ کسی بھی فرد کو دیکھیں جو بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی منزلوں سے گزرا ہو تو آپ دیکھیں گے کہ اس کی جوانی اس کے بچپن سے اور اس کا بڑھاپا اس کی جوانی سے مختلف ہے لیکن مختلف ادوار کے اس فرق کے باوجود وہ فرد اپنی فردیت یا اصلیت میں ایک ہی رہے گا۔ اسی طرح روایت کا معاملہ ہے۔ مختلف حالات کے تقاضوں کے مطابق یہ روایت کے مظاہر میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں لیکن روایت اپنی اصلیت میں بہرحال برقرار رہتی ہے۔

غالب نے جس روایت کی نشاندہی کی ہے وہ حرکی روایت ہے۔ زندگی کی طرح ہر صحت مند روایت حرکی ہوتی ہے۔ اسلام میں اجتہاد کا اصول یہ بات پوری طرح واضح کر دیتا ہے کہ مسلمانوں میں روایت کا تصور حالات کے تقاضوں کی مطابقت میں تبدیلیوں پر قدغن نہیں لگاتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں کچھ دانشور روایت میں تبدیلیوں کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ مسلمان دانشوروں کا رویّہ غیر مسلم معاشروں کے اثرات کا نتیجہ ہے مثلاً برصغیر میں ہندو قوم روایت کے جامد ہونے کی قائل ہے ان کے ہاں روایت میں تبدیلیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح مغرب میں افلاطون بھی سکونی تصور روایت کا قائل ہے۔ ان

غیر اسلامی تصوراتِ روایت نے ہمارے کچھ دانشوروں کو بھی متاثر کیا اور انھوں نے بھی اپنی روایت کے جوہر کو فراموش کر کے غیر اسلامی معاشروں کے تصورِ روایت کو اپنایا جس کا نتیجہ بے عملی اور مقدر پرستی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ بہرحال صبا صاحب ان صاحبانِ نظر میں سے ہیں جو اپنی روایت کے جوہر سے نہ صرف آگاہ ہیں بلکہ یہ روایت ان کے خون میں رچی بسی اور ان کے اپنے وجود کی حقیقت ہے جس کا اعلان انھوں نے اس طرح کیا ہے۔

یہ احترامِ روایت تو کم نہیں ہوگا
ہمارے خون میں شامل ہے کیا کیا جائے

آخر وہ احترامِ روایت کیا ہے جو صبا اکبر آبادی صاحب کے خون میں شامل تھا؟ یہ احترام کچھ ایسا ہی ہے جیسا کہ فریزر نے جدیدیت کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ جدیدیت ماضی کا احترام ہے۔ "MODERNITY IS A REVERANCE OF THE PAST" ماضی کے احترام کی حقیقت ہم پر اس وقت واضح ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی نے جدت کے سلسلہ کو برابر جاری رکھا ہے اور حالات کی مطابقت میں تبدیلیوں کو جگہ دے کر تہذیب و معاشرت کو مجموعی طور پر آگے بڑھایا ہے۔ ہم اگر مناسب تبدیلیاں لا کر تہذیب و معاشرت کو آگے بڑھاتے ہیں تو ہم ایک طرح ماضی کا احترام کرتے نظر آئیں گے۔ صبا اکبر آبادی نے سچ مچ ماضی کا احترام کیا اور ممکنہ حد تک روایت کو وسعت دینے اور آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری جگہ جگہ نامانوس کو مانوس بنا کر پیش کرتی ہے۔ نامانوس کا تعلق صبا صاحب کی اختراع سے ہے جب کہ مانوس بنانے کے عمل کا رشتہ ان کے طرزِ اظہار سے ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ شعر دیکھئے۔

بھیڑ تنہائیوں کا میلا ہے
آدمی آدمی اکیلا ہے

یہ شعر عہدِ حاضر کے احساس بیگانگی یا احساس اجنبیت کی بڑی مؤثر اور دلنشین تصویر ابھارتا ہے جو یقیناً میر کے اس شعر سے بالکل مختلف ہے۔

وجہِ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

بلاشبہ دونوں شعر احساس بیگانگی سے متعلق ہیں لیکن دونوں کی فضا مختلف ہے صبا صاحب کا احساس تنہائی آج کل کے مشینی دور کا عطیہ ہے اور اپنی نوعیت میں خالص زمینی مسئلہ ہے جب کہ میر صاحب کے احساس بیگانگی کی سمت مابعد الطبیعیاتی ہے اور انسان کے جنت سے نکل کر دنیا میں آنے کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیگانگی کو ظاہر کرتی ہے۔ صبا صاحب نے پہلے مصرعہ میں "تنہائیوں کے میلے" کی جو تمثیل ابھاری ہے وہ ہماری روایت میں اضافہ ہے جب کہ دوسرے مصرعہ میں "آدمی آدمی اکیلا" کہہ کر اس تمثیل یا روایت کے اس اضافہ کو بالکل مانوس بنا دیا ہے۔ یہاں "آدمی" کے لفظ کی تکرار سے کثرت ظاہر کی گئی ہے جو ٹھیٹھ روایتی انداز ہے اور پہلے مصرعہ کے نئے پن کی تکمیل کرتا ہے۔ صبا صاحب کا یہ انداز جدت کو روایت میں اور روایت کو جدت میں سمونے کا نہایت کامیاب عمل ہے۔ ان کے چند اشعار اور دیکھیے جہاں جدت اور روایت گلے ملتے نظر آئیں گی۔

ویرانیٔ مطلق کا اثر بول رہا ہے

جس گھر میں نہیں ہوں مرا گھر بول رہا ہے
سناٹا سرِ راہگذر بول رہا ہے
رستے میں مرا ذوقِ سفر بول رہا ہے
تنہائی زنداں میں سکوں پاؤں تو کیسے
کوئی پسِ دیوار اُدھر بول رہا ہے
پاؤں اٹھنے سے ہو گئے معذور
سامنے کس کی رہگذر آئی
تم گئے کیا غریب خانے سے
روشنی اُٹھ گئی زمانے سے
جو مجھے چھوڑ گیا ہے تنہا
شاید اب وہ بھی اکیلا ہوگا
دیکھ کر میری نگاہیں اس نے
دیر تک آئینہ دیکھا ہوگا

ان میں کوئی بھی شعر ایسا نہیں ہے جس میں معنی کی کئی کئی تہیں نہ ہوں لیکن ان میں ہر تہہ کا تعلق خالص زمینی مسائل سے ہے۔ آپ ان میں سے ہر شعر کو سیاست، معاشرت، اخلاقیات، معیشت یا ذاتی عشق و محبت کے جذبہ سے متعلق کر کے مختلف معنی اخذ کر سکتے ہیں لیکن ان میں سے کسی شعر میں بھی کوئی تہہ ایسی نہیں ہے جسے مابعد الطبیعاتی جدّت سے منسلک کیا جا سکے۔ ان اشعار کی یہی خصوصیت انہیں جدیدیت سے قریب کر رہی ہے۔

صبا اکبر آبادی کی جدید حسّیت ایک فطری عمل کے طور پر ظہور کرتی ہے وہ کسی روایت دشمنی یا ماضی سے بیگانگی کی پیداوار نہیں ہے۔ روایت دشمنی ایک منفی رویّہ ہے جس کے پس پشت خالص جذباتیت کار فرما نظر آتی ہے۔ صبا اکبر آبادی جذبات سے عاری ہرگز نہیں تھے لیکن جذباتیت کو انھوں نے کبھی اپنا شعار نہیں بنایا جس کی وجہ سے وہ جذبات کو عقل اور جوش کو ہوش کے تابع رکھنا جانتے تھے ان کی اس خوبی کا اندازہ ان کی فکری شاعری سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ اس انداز کی شاعری میں انھوں نے روایتی فکر کو تازگی کے پیکر میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

اچھا ہوں یا بُرا ہوں مجھے کچھ خبر نہیں
تصنیف ہوں کسی کی مصنف نہیں ہوں میں

یہ شعر ہمارے خالص روایتی عقیدہ کا مظہر ہے لیکن دوسرے مصرعہ میں خالق اور مخلوق کی جگہ تصنیف اور مصنف جیسے الفاظ کا استعمال عہدِ حاضر کے طرزِ اظہار کی غمازی کرتا ہے۔ چند اشعار اور ملاحظہ ہوں۔

عہدِ فراق تھا کہ پریشان خواب تھا
جب آنکھ کھل گئی شبِ فرقت نہیں رہی
غم کی یکسانیت نظر آئی

دل بھر آیا تو آنکھ بھر آئی
آئینہ میں بھی ان کا جلوہ تھا
اپنی صورت کہاں نظر آئی
عکس اس درجہ حسیں ہے جس کا
نہیں معلوم وہ کیسا ہوگا
کون بدلے گا خطِ پیشانی
جو مقدر میں ہے ہونا ہوگا
رکتے جاتے ہیں چلتے جاتے ہیں
قافلے گھر نہیں بناتے ہیں
حضورِ دوست چپ اس شرم سے ہوں
کہوں حال اپنا کیا اپنی زباں سے
صبا کعبے چلے ہو یہ بتا دو
مکیں سے واسطہ ہے یا مکاں سے

جدید قدیم کے جھگڑوں سے الگ صبا اکبر آبادی خالص شاعر ہیں۔ ان کے نزدیک شاعری انسانی فطرت اور خارجی مظاہر کے مابین رشتہ کی زندہ تصویر ہوتی ہے۔ ایسی زندہ تصویر جسے ان کے احساس وخیال کی تمثال کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ صبا صاحب زندگی بھر اپنے احساس وخیال کی تمثالیں ابھارتے رہے اور اس طرح نہ صرف اپنے آپ کو دوسروں سے روشناس کراتے رہے بلکہ اپنے ہونے کا تماشا خود بھی کرتے رہے۔ اپنے ہونے کا تماشا صرف اس صورت میں ممکن ہے جب آدمی اپنے آپ سے واقف بھی ہے اور صبا صاحب جن تہذیبی قدروں کے قائل تھے ان کے مطابق انسان کا سب سے بڑا کارنامہ خود اپنے آپ کو دریافت کرنا تھا۔ خود کو دریافت کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان ساری دنیا سے بیزار ہو کر کسی کونے میں بیٹھ جائے اور آنکھیں بند کر کے خود کو دریافت کرنے لگے۔ یہ عمل خود کو دریافت کرنے کا نہیں بلکہ خود کو گم کرنے یا کھونے کا عمل ہے۔ صبا صاحب انسانی فطرت اور خارجی مظاہر کے رشتے کی تصویریں ابھارنے میں منہمک رہتے اور اس طرح عالم خارجی سے اپنا تعلق مستقل طور پر برقرار رکھتے ہیں۔ وہ گوشہ نشین ہو کر خود کو کھونے کے عمل سے ہمیشہ دور رہے۔ اسی طرح عالم خارجی سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ اپنی ذات کے باہر عزت، دولت یا شہرت کی تلاش میں سرگرداں کبھی نہیں دیکھے گئے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ انسان خارجی عالم سے کٹ کر ہی خود کو نہیں کھوتا بلکہ بعض صورتوں میں خارجی عالم سے متعلق ہو کر بھی خود کو گم کر دیتا ہے۔ عالم خارجی میں اپنی ذات کو بھلا کر عزت، دولت یا شہرت کا سودا کرنا ایسا ہی خسارے کا سودا ہے۔ ان کے مزاج نے انھیں اس خسارے سے ہمیشہ محفوظ رکھا چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مجھ سے بہتر تو بہت آئیں گے
کوئی مجھ سا نہیں پیدا ہوگا
کون ہوگا تری وحشت کا حریف
اپنے ہی آپ سے لڑنا ہوگا

نکل آیا ہجوم دوستاں سے
سکون قلب کی حد ہے یہاں سے

یہ اور اس طرح کے بہت سے اشعار میں جہاں صبا اکبر آبادی خود اپنا تماشا کرتے اور اس تماشے کی صورت اسی جیسی تمثالوں کے ذریعے ابھارتے نظر آتے ہیں جن میں دوسرے لوگ بھی پوری طرح محو ہو کر صبا اکبر آبادی صاحب کو دیکھنا اور پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔

صبا صاحب ایک سچے شاعر اور چابک دست فنکار ہیں۔ وہ شاعری کو صرف اپنے خون جگر کی نمائش تک محدود نہیں سمجھتے بلکہ وہ جذبہ و احساس کے فنکارانہ اظہار کو شاعری سمجھتے ہیں ان کا ایک شعر دیکھئے۔

شعروں میں مرا خونِ جگر بول رہا ہے
الفاظ ہیں خاموش ہنر بول رہا ہے

لفظوں کے عام معنی سے ہٹ کر انھیں اس طرح استعمال کرنا کہ مفہوم اپنی تمام تر نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ واضح ہو جائے دراصل شاعری یا ادب کا ہنر ہے۔ صبا اکبر آبادی اس ہنر پر قدرت رکھتے تھے۔ ان کے اس ہنر کا اظہار صرف غزلوں ہی سے نہیں بلکہ اردو کی تمام مروجہ اصناف میں ہوا ہے انھوں نے غزل، نظم، مرثیہ، منظوم تراجم، ملی ترانے الغرض ہر صنعت سخن کو برتا ہے اور ہر صنعت میں اپنی انفرادیت کو تسلیم کرایا ہے تاہم وہ بنیادی طور پر غزل اور مرثیہ کے شاعر تھے۔ غزل کی طرح مرثیوں میں بھی انھوں نے عہدِ جدید کو اس طرح سمویا ہے کہ روایتی اقدار پامال بھی نہیں ہوئیں اور جدید عہد کی تازگی اور اس سے بامعنی تعلق بھی اجاگر ہو گیا ہے۔ انھوں نے عمر خیام اور غالب کی فارسی رباعیوں کے ترجمے میں بھی مفہوم کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوئے اپنے انداز بیان کی مہر ثبت کی ہے جو واقعی بہت مشکل کام تھا۔

صبا اکبر آبادی زبان کے معاملہ میں سند تصور کیے جاتے ہیں اور اب ان کے اس دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد لفظوں کا ایسا مزاج شناس کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ اپنی روایت اور اپنی تہذیب سے وابستہ رہ کر عہد جدید کے تقاضے پورے کرنا انہیں کو آتا تھا۔ جب ہم ان کی ان منفرد خوبیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ان کی رحلت نہ صرف دنیائے شعر و ادب کا بلکہ ہماری پوری تہذیب و ثقافت کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔

اسلوبیاتِ میر

مصنف

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

قیمت: ۲۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

طاہر مسعود

ایک باغی عورت کی موت

عصمت چغتائی چل بسیں۔ اکیاسی سال تک زندگی کے سارے رنگ وروپ دیکھنے اور زمانے کے سرد و گرم کا مزہ چکھنے کے بعد ایک صبح ..... ۲۴، اکتوبر ۹۱ء کی ایک خوشگوار صبح کو بمبئی میں چرچ گیٹ کے قریب تین کمروں کے کھلے فلیٹ میں سکون کی گہری نیند سو گئیں۔ موت کا ظاہری سبب معلوم نہ ہو سکا کہ بظاہر صحت یاب اور خوش و خرم تھیں۔ اس سانحے کی اطلاع کے بعد پاکستان و ہندوستان کے ادبی اور غیر ادبی حلقوں کا جو ردّ عمل سامنے آیا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی ادبی خدمات کا ہماری تہذیبی و معاشرتی زندگی سے کتنا گہرا تعلق تھا۔ جہاں تک ان کی آخری وصیت کا معاملہ ہے اسے کم سے کم لفظوں میں نہایت تکلیف دہ کہا جا سکتا ہے..... تاہم اس سے ان کی ادبی اور تاریخی اہمیت متاثر نہیں ہوتی۔

عصمت چغتائی ۳۶ء کی دہائی کے چار اہم اور مقبول افسانہ نگاروں میں شامل تھیں۔ اردو افسانے کے اس دور زرّیں میں تعداد اور معیار دونوں اعتبار سے افسانہ نگاروں کی ایک نئی کھیپ منظر عام پر آئی لیکن جو شہرت اور اہمیت منٹو، کرشن، بیدی اور عصمت کے حصے میں آئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکی اور اس حقیقت کے باوجود کہ ان چاروں افسانہ نگاروں کے فن کے اپنے اپنے انفرادی خصائص ہیں اور وہ اسلوب، موضوعات اور رجحان کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں لیکن ان چاروں کے نام بالعموم ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح نتھی ہیں کہ ایک کا نام آتے ہی باقی تینوں نام از خود پردۂ ذہن پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ افسانوں کے موضوعات کے چناؤ اور ان کے برتنے کے ضمن میں جرأتِ اظہار کی حد تک منٹو اور عصمت کا تذکرہ ایک ہی ذیل میں ہوتا ہے۔

منٹو اور عصمت میں قدر مشترک یہ ہے کہ ہر دو نے جنس اور جنسی کجروی کو اپنا موضوع بنایا۔ فرد کی زندگی میں جنسی جبلّت کے کردار کو اجاگر کیا۔ معاشرے میں چھپی ہوئی جنسی غلاظت، کجروی اور الجھنوں کو پیش کیا۔ جس کے نتیجے میں دونوں بدنام ہوئے، قانون کی گرفت میں آئے ..... لیکن یہ سارا ردّ عمل وقتی اور ہنگامی تھا، وقت گزرنے پر معلوم ہوا کہ منٹو اور عصمت نے سماج کے گلے سڑے زخموں سے فاسد مادّے کے اخراج کے لیے اپنے بے باک قلم کو ڈاکٹر کے نشتر کے طور پر استعمال کیا۔ انھوں نے پڑھنے والوں میں حقائق سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ پیدا کیا اور لکھنے والوں کو اظہار کی جرأت بخشی۔ یہاں یہ وضاحت شاید غیر ضروری نہ ہو کہ عصمت اور منٹو میں موضوع اور رجحان کی یکسانیت کے باوجود ان میں زاویۂ نگاہ کا فرق نمایاں طور پر موجود ہے۔ منٹو اور عصمت دونوں کی اپنی اپنی انفرادی نظر ہے اور اس نظر کے موافق زندگی کی تخلیق میں دونوں کامیاب رہے ہیں۔

عصمت چغتائی کو اپنے معاصرین میں کئی لحاظ سے فوقیت حاصل ہے۔ وہ پہلی خاتون افسانہ نگار ہیں جنھوں نے ایسے موضوعات پر جرأت و بے باکی سے قلم اٹھایا جس کا برصغیر کے قدامت پسند معاشرے میں تصور بھی محال تھا۔ انھوں نے اپنے افسانوں کا محور متوسط طبقے کے "گھر" کو بنایا اور صدیوں سے دبی اور کچلی ہوئی ہندوستانی عورت کو بولنا سکھایا۔ فنی لحاظ سے ان کا امتیاز ان کے افسانوں کی زبان و بیان ہے۔ محاورے، روزمرہ اور عام بول چال کی جیسی رواں زبان لکھنے پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل ہے اس میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

عصمت سے پہلے جو خواتین افسانے اور ناول لکھتی آئی تھیں، ان کے موضوعات بالعموم معاشرتی یا رومانی نوعیت کے ہوتے تھے، عصمت نے ان سے انحراف کیا اور اپنے لیے بالکل الگ راہ نکالی۔ انھوں نے اپنے گردوپیش میں جو کچھ دیکھا، اسے بلاکم و کاست ادب کا حصہ بنا کر اس دور کی معاشرتی حقیقتوں کو ادبی تاریخ میں محفوظ کر دیا۔ اسے عصمت کی خوش نصیبی کہیے یا بد نصیبی کہ ان کی شہرت کا سبب وہ افسانے قرار پائے جنھیں ان کے فن کا نقطۂ کمال مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے۔

جن افسانوں کے حوالے سے وہ مرکز توجہ بنیں ان کی وجوہ ادبی سے زیادہ غیر ادبی ہیں۔

عصمت چغتائی کی شخصیت اور فن پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ عصمت کو تنقیدی سطح پر نظر انداز کرنے یا کم اہمیت دینے کی ایک مثال یہ ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی نہایت سلیقے سے مرتب کی ہوئی ضخیم کتاب "اردو افسانہ، روایت اور مسائل" میں جہاں عصمت کے معاصرین پر کئی کئی مضامین ہیں وہاں عصمت کے فن پر صرف ایک ہی مضمون شامل کیا گیا ہے۔ حالانکہ عصمت چغتائی کے فن کے علاوہ ان کی شخصیت "عورت" ہونے کے باوصف بھی خصوصی مطالعے و تجزیے کا موضوع بن سکتی ہے۔ اس حوالے سے کہ وہ اردو ادب کی تاریخ کی وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے "باپردہ گھرانوں" کو بے پردہ کرنے کا تاریخی کارنامہ انجام دیا۔

عصمت چغتائی کی زندگی کے ابتدائی حالات پر نظر ڈالیے تو جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ ہے ان کا ناآسودہ بچپن۔ وہ اپنے والدین کی دسویں اولاد تھیں۔ گویا جب انھوں نے آنکھیں کھولیں تو گھر میں پہلے ہی بھائی بہنوں کی ریل پیل تھی۔ اس ماحول میں انھیں احساس ہوا کہ گھر میں ان کی حیثیت محض UN WANTED CHILD کی ہے۔ اپنے مشہور ناول "ٹیڑھی لکیر" میں ان احساسات کو انھوں نے نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔

"وہ پیدا ہی بے موقع ہوئی تھیں ..... نو بچوں کے بعد ایک اضافہ جیسے گھڑی کی سوئی ایک دم آگے بڑھ گئی اور دس بج گئے ..... خدا غارت کرے اس منی سی بہن کو، اماں کی کوکھ بند کیوں نہیں ہو جاتی" حد ہو گئی تھی کہ بہن بھائی اور بہن بھائی بس معلوم ہوتا تھا کہ بھک منگوں نے گھر دیکھ لیا ہے۔ اُمڈتے چلے آتے ہیں۔ ویسے ہی کیا کم موجود تھے جو اور پے در پے آ رہے تھے۔ کتے بلیوں کی طرح ..... ازل کے مریکھے!" (ص ۸، ۹)

اپنے بچپن کے حالات کا ذکر انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں بھی کیا۔

"ہمارا معیار زندگی پست تھا ..... میری اماں کے بارہ بچوں میں سے دس باقی بچے تھے ..... میرا یہ حال تھا کہ نیم کولیاں تک کھا جاتی تھی۔ ہم سارے بچے جانوروں کی طرح رہتے تھے۔ کھانا جو ہلکا پھلکا ملتا تھا۔ میری اماں کہتی تھیں ..... "سنتے ہیں لوگوں کے بچے مر جاتے ہیں میرا کم بخت تو ایک نہیں مرتا۔"

اس انٹرویو میں انھوں نے بتایا: "اپنے بہن بھائیوں میں میرا نمبر دسواں تھا۔ گھر میں چھوٹوں پر حکم چلانا بڑوں کا حق سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا ہمیں ہر وقت ڈانٹ پڑتی رہتی تھی۔ اماں بھی بچوں سے عاجز تھیں۔ جب بھی ان کے ہاتھ لگ جاتی، پیٹ ڈالتی

تھیں۔" (بحوالہ "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے")

عصمت کو شروع ہی سے اس کا شدت سے احساس تھا کہ ان کی باری آئی تو والدین کی محبت کا پیالہ خالی ہو چکا تھا اور ان کے حصے میں صرف تلچھٹ آیا تھا۔ اس احساس نے ان کی شخصیت پر کیا اثرات مرتب کیے ہوں گے اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ مزید یہ کہ کھیلنے کودنے کی عمر آئی تو بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں سو ان کا بچپن بھائیوں کے درمیان گزرا۔ جس کے نتیجے میں ان کے اندر مردانہ خصائص کو تقویت ملی۔ انھیں عام لڑکیوں کی طرح گڈے گڑیا کا بیاہ رچانے جیسے کھیل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ..... سارا وقت بھائیوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلنے اور لڑنے جھگڑنے میں گزرتا تھا۔..... "اعتراض و نکتہ چینی" کو جھیلنے اور انھیں نظر انداز کرنے کی تربیت بھی اسی زمانے میں ہوئی۔ کیوں کہ گلی ڈنڈا کھیلنے پر اعتراض ہوا، لڑکوں جیسی سرگرمیاں رکھنے پر نکتہ چینی ہوئی، لیکن عصمت پر اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ رفتہ رفتہ چکنا گھڑا بنتی گئیں۔ گھر کا ماحول کچھ اس قسم کا تھا: "میں اور میرا بھائی اشیر بیگ ہم میں بڑی دوستی تھی۔ ایک اونچا تخت تھا جب بیبیاں باتیں کرتی تھیں تو ہم اس تخت کے نیچے چھپ کر یہ باتیں سنا کرتے تھے اور جونہی ہم پر ان کی نگاہ پڑتی تھی وہ ہمیں بھگا دیتی تھیں۔ جس سے ہمیں یہ شبہ ہوا کہ یہ ضرور گندی باتیں کرتی ہیں۔ شروع میں ان کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھیں پھر بعد میں آہستہ آہستہ آنے لگیں۔"

ان کا لکھنے کی طرف مائل ہونے کا محرک بھی ایک ذاتی ضرورت بنا۔

"جب بھی اماں مجھے پکڑنے کی کوشش کرتیں، میں بھاگ کر کہیں چھپ جاتی اور تب وہ بھائی صاحب کو مجھے پکڑ کر لانے کے لیے کہتیں اور بھائی صاحب میرا پیچھا کرتے ہوئے کہتے کہ جلدی سے پکڑا جا تو تجھے کم پٹواؤں گا اور یوں ہمارا سمجھوتہ ہو جاتا۔ اور جب اماں مجھے پیٹنے لگتیں تو بھائی صاحب مجھے چھوڑ دیتے تھے۔ میں بھاگ جاتی تھی اور اماں چیختی رہ جاتی تھیں "ارے اسے پکڑ کر لاؤ" اسی ماحول میں مجھے اندازہ ہوا کہ اگر بولیں گے تو مار پڑے گی تو میں نے اپنے جذبات کے اظہار کی راہ نکالی اور جس کے خلاف لکھنا چاہتی تھی، لکھ دیتی تھی۔"

دوسرے لفظوں میں عصمت کے لیے لکھنا محض مشغلہ یا ذاتی دلچسپی کی چیز نہیں تھی بلکہ یہ تو اپنے ہونے کا جواز تھا، حالات کو جھیلنے اور اسے بسر کرنے کا ایک طریقہ تھا، انھوں نے اس گفتگو میں آگے چل کر کہا تھا "میں بہت چھوٹی عمر سے اپنا غصہ، اپنی ناامیدیاں اور ناکامیاں لکھ کر ہی زندہ رہی، مجھے جب بھی کبھی دکھ ملا ہے، جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی ہے، میں نے اسے لکھ دیا ہے چاہے وہ چھپا ہو یا نہ ہو۔ میں سوچتی ہوں لوگ لکھے بغیر کیسے زندہ رہ لیتے ہیں۔"

عصمت کو ادب کی چوٹی سر کرنے کے لیے بہت محنت کرنی پڑی۔ اوائل عمری میں وہ حجاب اسمٰعیل کی رومانی تحریروں کے سحر میں رہیں لیکن پھر انھوں نے عالمی ادب کا مطالعہ شروع کیا۔ دوستووسکی سمرسٹ، مایم، چیخوف اور ہنری سے انھوں نے کہانی کہنے کا سلیقہ سیکھا۔ اردو افسانے کے کئی نقادوں نے ان کے افسانوں پر ڈی ایچ لارنس کے اثرات تلاش کیے ہیں لیکن میری معلومات کے مطابق جس زمانے میں انھوں نے "لحاف" جیسا افسانہ لکھا، اس وقت تک انھوں نے نہ لارنس کو پڑھا تھا اور نہ فرائیڈ کے نظریۂ جنس سے واقف تھیں۔ البتہ وہ بعد میں اس بات کی بہت زیادہ قائل ہو گئی تھیں کہ افسانہ نگاروں کو نفسیات اور معاشیات کے علم کا مطالعہ توجہ اور انہماک سے کرنا چاہیے۔ (یہ مشورہ انھوں نے کراچی کی ایک خاتون افسانہ نگار کو اپنے ایک خط میں دیا تھا) افسانہ لکھنے کے سلسلے میں بھی ان کا طریقہ کار اپنا وضع کردہ تھا۔ وہ ٹرینوں اور بسوں میں سفر کرتے ہوئے لوگوں کی گفتگو سنتی تھیں اور اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتی تھیں اور بعد ازاں انھیں اپنے افسانوں میں استعمال کرتی تھیں۔ اسی لیے ان کے

افسانوں کی زبان عام بول چال کی زبان ہوتی ہے۔

عصمت چغتائی نے اپنے افسانے اور اسلوب زندگی سے کئی نسلوں کو متاثر کیا۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن آج جو نئی دنیا ہمارے گرد و پیش میں موجود ہے اس کی تعمیر و تشکیل میں یقیناً ان کا حصہ بھی ہے اور اس لحاظ سے وہ ادبی تاریخ ہی میں نہیں ہماری تہذیبی و معاشرتی تاریخ میں بھی ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

جدید اردو شاعری

(بابائے اردو یادگاری لیکچر ۱۹۸۸)

عزیز حامد مدنی

صفحات: ..... قیمت: ۱۲۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

البیرونی

تیسرا ایڈیشن

مصنف: سید حسن برنی مرحوم

قیمت: ۶۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

ڈاکٹر وقار راشدی

شہاب الدین رحمت اللہ

شہاب الدین رحمت اللہ ۷۹ سال کی عمر میں اس جہان رنگ و نور سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے۔ ان کی زندگی کے ساٹھ سال کا ایک ایک لمحہ انسانوں سے محبت، ملک و ملت کی خدمت، ماحول و معاشرے کی تعمیر و تشکیل، وطن عزیز کے ترقی و استحکام، علم و فن کے فروغ اور اردو زبان و ادب کی ترقی و اشاعت میں گزرا۔

شہاب الدین رحمت اللہ ۹ جون ۱۹۱۳ء کو ضلع شاہ آباد صوبہ بہار (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ لاء کالج پٹنہ سے ۱۹۳۳ء میں بے اے (آنرز) معاشیات کے بعد ۱۹۳۵ء میں انڈین سول سروس کے امتحانات میں امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ اسی سال انگلستان بھیجے گئے۔ وہاں آکسفورڈ کے جیسز کالج میں مزید تعلیم و تربیت کے بعد ۱۹۳۷ء میں وطن واپس آگئے۔ لندن کے دوران قیام "آنریبل سوسائٹی آف دی مڈل ٹمپل" سے بیرسٹرایٹ لاء کیا اور آکسفورڈ کے "زیسکن اسکول آف ڈرائینگ" سے فن مصوری کی سند حاصل کی۔

۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک حکومتِ برطانیہ کی سول سروس کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۴، اگست ۱۹۴۷ء کو ضلع ڈھاکا کے پہلے ڈی سی مقرر ہوئے۔ انھیں یہ اعزاز حاصل ہوا کہ انھوں نے قیام پاکستان کے پہلے دن ہی ڈھاکا مشرقی پاکستان میں پاکستان کا پہلا پرچم بلند کیا۔

شہاب الدین رحمت اللہ نے تقسیم ہند سے پہلے حصول پاکستان کے لیے جدوجہد اور تخلیق پاکستان کے بعد اس کی ترقی و بقا کے لیے جو اہم کردار ادا کیا وہ ہماری قومی تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ اس سلسلے کے تاریخی واقعات خود شہاب صاحب نے اپنی خود نوشت سوانح عمری "یادیں اور روایتیں" میں بیان کیے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کے تحفظ اور قائدِ اعظم کے جلسوں کو شایانِ شان کامیاب بنانے میں جو رول ادا کیا اس کا تذکرہ خود ان کے قلم سے ان کے اُس مضمون میں بھی موجود ہے جو "قائدِ اعظم کا تاریخی سفر" کے زیر عنوان قائدِ اعظم کے صد سالہ جشنِ ولادت کے موقع پر ماہنامہ "قومی زبان" کراچی (یکے مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان) میں شائع ہو چکا ہے۔

شہاب صاحب مشرقی پاکستان میں مسلسل پانچ سال کمشنر رہنے کے بعد ۱۹۵۹ء میں سیکریٹری پاکستان منصوبہ بندی کمیشن کی حیثیت سے آئی سی ایس پنشن کے ساتھ سبکدوش ہوئے۔ ڈھاکا واپس جا کر وہاں اپنا لاء چیمبرز (قانونی مشاورتی ادارہ) قائم کیا۔ اسی زمانے میں صدر پاکستان محمد ایوب خان نے گورنر مشرقی پاکستان منعم خان کی مخالفت کے باوجود شہاب صاحب کو کانویکیشن مسلم لیگ کی اعلیٰ کمان یعنی مرکزی مجلس عاملہ کا رکن نامزد کیا۔ لیکن سیاست کے جوڑ توڑ ان کے مزاج کے خلاف تھے اس لیے مستعفی ہو

گئے اور سیاست سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کشی اختیار کرلی۔

شہاب صاحب ایک اعلیٰ دماغ، انسان دوست اور روشن ضمیر ایڈمنسٹریٹر تھے۔ جب ۴۸-۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے پانچ لاکھ مہاجرین کا ستم زدہ، فاقہ کش، بدحال قافلہ گرتا پڑتا، مرتا کٹتا ڈھاکا پہنچا تو انھوں نے مرکزی و صوبائی حکومتوں کی امداد، ذاتی کوششوں اور شب و روز کی محنت شاقہ سے فوری طور پر مہاجرین کی رہائش و آبادکاری کا انتظام کیا۔ نئی نئی بستیاں بسائیں، اتنی بڑی تعداد میں اردو بولنے والوں کے بچوں کے لیے اردو میں تعلیم کی غرض سے چھوٹے بڑے ادارے قائم کیے جن میں مشرقی پاکستان کا سب سے پہلا اردو کالج "قائد اعظم میموریل کالج ڈھاکا"، "رحمت اللہ انسٹی ٹیوٹ"، "رحمت اللہ اکیڈمی نرائن گنج"، رحمت اللہ ماڈل ہائی اسکول" ڈھاکا وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ان اداروں نے رحمت اللہ صاحب کے زیرِ سرپرستی و نگرانی جس انداز میں قوم کے نونہالوں کو زیورِ علم و ادب سے آراستہ کیا، پاکستان کو لائق سپوت عطا کیے، اردو کا چراغ روشن رکھا وہ شہاب صاحب کا ناقابلِ فراموش ملی و قومی کارنامہ ہے۔

قیام بنگلہ دیش کے بعد شہاب صاحب خراب و خستہ اور ناگفتہ بہ حالات میں نیپال اور تھائی لینڈ کے راستے ۳۰ جون ۱۹۷۲ء کو کراچی پہنچے۔ یہاں آخری دم تک تصنیف و تالیف میں مصروف رہے اور بھرپور زندگی گزارنے کے بعد ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو وفات پائی۔

شہاب الدین رحمت اللہ انگریزی، اردو کے معروف شاعر، ادیب اور مترجم تھے۔ انھیں فنِ مصوری سے فطری شغف تھا جوانی میں شہسواری اور شیروں کے شکار کا شوق رکھتے تھے۔ فوٹوگرافی میں شہرت کی وجہ سے برٹش رائل سوسائٹی لندن اور علامہ اقبال سے عقیدت کی بناء پر اقبال اکادمی پاکستان کے لائف ممبر رہے۔

شہاب صاحب نے اردو زبان و ادب کو ملکی و غیر ملکی انگریزی داں طبقوں سے روشناس اور اردو کی اہمیت کو تسلیم کرانے میں جو غیر معمولی خدمات انجام دیں ان کو بھلا دینا آسان نہیں ہے۔ اس حقیقت کا ناقابل تردید ثبوت خود ان کے انگریزی تراجم اور تصانیف ہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ آرٹ اِن اردو پوئٹری

۱۹۵۵ء میں ڈھاکا سے شائع ہوئی۔ یہ اردو کی ابتدا سے اقبال تک کے اردو شعراء کا انگریزی میں پہلا تذکرہ ہے۔ اس میں اردو اشعار کے انگریزی اشعار میں ترجمے خود شہاب صاحب نے کیے ہیں۔ اشعار سے متعلق تصویریں بھی ان ہی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہیں۔ ان کے فنِ مصوری کو پاکستان کے عظیم مصور عبدالرحمان چغتائی نے بہت پسند کیا تھا۔

"آرٹ ان اردو پوئٹری" کا پیش لفظ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے تحریر فرمایا۔ اس کتاب کی افادیت و اہمیت کے بارے میں بابائے اردو کی یہ رائے سندِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

> "نظم کا نظم میں ایسا ترجمہ کرنا کہ مفہوم میں فرق نہ آنے پائے اور اصل کی خوبی اور زورِ بیان قائم رہے نہایت دشوار ہے۔ یہ فاضل مؤلف کی قدرتِ زبان کا کمال ہے کہ انگریزی ترجمہ نہایت صفائی اور خوش اسلوبی سے ایسی اچھی زبان میں کیا ہے کہ جسے پڑھ کر ان لوگوں کو جو اردو سے ناآشنا ہیں اصل شعر کا لطف آجائے گا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ قابل مؤلف شعر کا ذوق ہی نہیں رکھتے شاعر بھی ہیں۔

مؤلف نے اشعار کے مفہوم کو تصاویر کے روپ میں ظاہر کیا ہے۔ یہ کام انھوں نے اپنے کیمرے اور موئے قلم سے لیا ہے۔ اس سے کتاب کی رونق اور دلکشی میں اضافہ ہوگیا ہے۔"

دستخط
عبدالحق
صدر انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی

۲۔ ہنڈریڈ جیمس فرام غالب۔ (غالب کے سو اشعار)
ناشر نیشنل بک فاؤنڈیشن، کراچی ۱۹۸۰ء
پیش لفظ میجر جنرل سید شاہد حامد۔ اس میں شہاب صاحب کی پینٹنگ کے علاوہ چغتائی اور صادقین کی بنائی ہوئی تصاویر بھی زینتِ کتاب ہیں۔
ٹِن جمس فرام غالب (مصور)
غالب کے دس منتخب اشعار کا منظوم ترجمہ۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۳ء سر تیجے بہادر سپرو، سر رادھا کرشنن اور ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی جیسے مشاہیر نے اس ترجمے کو بے حد سراہا۔ ڈاکٹر مبارک نے ایک نظم کی صورت میں اپنے تاثرات کا یوں اظہار کیا۔

یہ ٹِن جیمس غالب کے ہیں وہ جواہر
ہر اک کو جواہر کی اک کان کہیے
یہ دس شعر غالب کے وہ منتخب ہیں
کہ ہر شعر کو ایک دیوان کہیے
نئی چیز اردو کو یہ ہاتھ آئی
مبارک اسے تازہ عنوان کہیے

اس کا دوسرا ایڈیشن بھی باتصویر ہے جو ۱۹۴۵ء میں کلکتے سے طبع ہوا۔ اس ایڈیشن کا پیش لفظ اُس وقت کے گورنر بنگال کی اہلیہ لیڈی مائیپ کیسی نے لکھا تھا۔

۴۔ دی کال آف دی بِل (باتصویر)
علامہ اقبال کی بانگِ درا کا مکمل منظوم ترجمہ۔ پیش لفظ مشہور مشرقی خاتون اسکالر پروفیسر این میری شیمل۔ امریکہ کے ایک اشاعتی ادارے کی جانب سے قریب الاشاعت ہے۔ راقم نے شہاب صاحب کے پاس اس کی ڈمی دیکھی تھی۔

۵۔ شہاب ان انگلش۔ تصاویر از مصنف۔
تعارفِ مصنف: ڈاکٹر وفا راشدی، پہلا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں فیروز سنز پرنٹرز لمیٹڈ کراچی سے طبع ہوا۔ اس کتاب میں شہاب صاحب نے اپنے شعری مجموعے "سحرِ جلال" کی غزلیات کا انگریزی میں اردو ترجمہ کیا ہے۔ شروع میں غزل اور اس کے فن پر شہاب

صاحب کا ایک مبسوط مقدمہ بھی شامل کتاب ہے۔

۶۔ انجیلک ویسپرس (ANGELIC WHISPERS)

یہ "شہاب ان انگلش" کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ اسے وائنیج پریس نیویارک نے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا ہے۔ اس میں لائبریری آف کانگریس کیٹلاگ کارڈ نمبر ۹۰۰۳۳-۸۹ درج ہے۔

اردو تصانیف

۱۔ مرقعِ شہاب

پہلا ایڈیشن کراچی سے دوسرا دہلی سے طبع ہوا۔

۲۔ سحرِ جلال

مرتبہ ڈاکٹر وفا راشدی مطبوعہ مکتبہ اشاعتِ اردو کراچی ۱۹۸۵ء یہ دونوں مجموعے شہاب صاحب کی غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہیں۔ ان میں اشعار کے حوالے سے جو تصاویر ہیں وہ بھی شہاب صاحب کے فنِ مصوری کا عمدہ نمونہ ہیں۔

۳۔ یادیں اور روایتیں

یہاں اس امر کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا کہ شہاب الدین رحمت اللہ راقم السطور سے بے حد شغف فرماتے تھے۔ اسے اپنے ادبی کارناموں سے باخبر رکھتے تھے یہ رشتہ کلکتے سے کراچی تک برابر استوار رہا راقم ہی کی تحریک پر انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری تحریر فرمائی۔ انھوں نے اپنے آخری مکتوب مورخہ ۲۰ مئی ۱۹۹۱ء کے ذریعے راقم کو مطلع فرمایا تھا کہ مستقبل قریب میں جناب مشفق خواجہ کی کوششوں سے یہ خود نوشت کراچی کے ایک اشاعتی ادارے کے زیرِ اہتمام منظرِ عام پر آنے والی ہے۔ کاش یہ خود نوشت ان کی زندگی ہی میں چھپ سکتی۔

غزل نما

قدیم شعرا کا تعارف و انتخابِ کلام

ادا جعفری

قومی زبان میں شائع ہونے والے انتخاب

کتابی شکل میں

قیمت: ۱۰۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

انجمن کی اجازت سے "غزل نما" ہندوستان میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے بھی شائع کیا ہے

بابا ذہین شاہ تاجی، جناب جوش ملیح آبادی کے چہرے کو محبت سے ہاتھوں کے غرفے میں لیے ہوئے۔

افتخار احمد عدنی

یادوں کا سفر۔ جناب جوش ملیح آبادی

جوش صاحب میں ایک عجیب کمال میں نے یہ دیکھا کہ اُن کی موجودگی دوسروں کو اُن ہی بے احتیاطیوں کی دعوت دیتی تھی جن سے وہ خود بابا ذہین شاہ صاحب کی محفل میں کچھ دیر بیٹھ کے محتاط ہو جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اُن کی خاموش دعوت پر لبیک کہنے والوں کو اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا تھا۔ دو دفعہ میں خود اس قسم کے حادثوں سے دوچار ہو چکا ہوں۔

ایک دفعہ یہ ہوا کہ بابا صاحب نے جوش صاحب کے لیے اپنے گھر پر ایک چھوٹی سی محفل سماع کا اہتمام کیا۔ جب تقریباً ڈھائی گھنٹے بعد محفل ختم ہوئی اور بابا صاحب اُٹھ کر تھوڑی دیر آرام کرنے کی خاطر اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں نے جوش صاحب سے پوچھا کہ کیا مُنہ کا مزا بدلنے کے لیے وہ ریختی کی کوئی چیز سننا پسند کریں گے۔ جوش صاحب نے کسی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا لیکن، کیا مضائقہ ہے، کہہ کر مجھے اس بے احتیاطی کی اجازت دے دی۔ میں نے سعادت یار خان رنگین کے چار شعر قوالوں کو لکھ کر دے دیے۔ بات یہ ہے کہ رنگین کا مطلع جب میں نے پہلی بار پڑھا تھا تو مجھے احساس ہوا تھا کہ زندگی میں عورت پر جو قیامت گزرتی ہے اُسے شاعر نے کس اختصار اور کس کمال سے صرف دو مصرعوں میں ادا کر دیا تھا اور چونکہ بات عورت ہی کی زبان سے کہی گئی تھی، اس لیے اس میں بڑی بے ساختگی تھی رنگین کا مطلع ہے۔

جو ہونی تھی وہ بات ہو لی کہارو
چلو لے چلو میری ڈولی کہارو

اس شعر میں رنگین نے نسائیت کے ایک بہت بڑے المیے کو کمالِ دردمندی سے بیان کیا ہے۔ محبت کے ہاتھوں عورت پر جو گزرتی ہے، جس بے بسی سے وہ دوچار ہوتی اور جس طرح وہ اس پہ صبر کرتی ہے، سب کچھ اس ایک سادہ سے شعر میں آگیا ہے۔ جب میں نے یہ شعر پڑھا تو مجھے ٹالسٹائے کا ناول اینا کیرینا یاد آگیا۔

ٹالسٹائے وارانسکی اور اینا کے سانحۂ وصل کو جس طرح بیان کیا ہے اُسے پڑھے بغیر اس درد کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا جو مجھے ریختی کے اس شعر میں نظر آیا تھا۔

ٹالسٹائے نے کچھ اس طرح لکھا ہے "ایک سال سے وارانسکی کی جو شدید تمنا تھی اور جس نے تمام تمناؤں کو محو کر دیا تھا، اور جو اینا کے لیے ایک ناممکن خواب تھا، ناممکن، دہشتناک، اور شاید اسی وجہ سے اور بھی دلکش خواب، بالآخر وہ سب کچھ ہو گیا۔ وارانسکی کا چہرہ زرد ہو گیا، اُس نے اینا پر جھکتے ہوئے التجا کی "خدا کے لیے اپنے آپ کو سنبھالو، ..... اینا کا مغرور سر شرم سے جھک گیا تھا، وہ صوفے سے ڈھلک کے فرش پر اس کے قدموں سے لگ گئی .....

اینا کو اس قدر سخت احساسِ جرم تھا اور وہ خود کو اتنا موردِ الزام سمجھ رہی تھی کہ اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا

کہ وہ اس کے قدموں میں گر کے معافی مانگے۔ جب اُس نے آنکھیں اُٹھا کر وارانسکی کو دیکھا تو اُسے شدت سے اپنی جسمانی تحقیر کا احساس ہوا۔.....

اینا نے کہا "سب کچھ ختم ہو گیا، یاد رکھنا کہ اب میرے پاس تمہارے علاوہ کچھ نہیں بچا ہے، جب وارانسکی اُس کے درد کی گہرائی کو نہ سمجھ سکا تو اینا تیزی سے اُٹھی اور اُسے چھوڑ کے چلی گئی"

یہ سب پڑھنے کے بعد ایک بار پھر رنگین کے شعر پر نظر ڈالیے۔

جو ہونی تھی وہ بات ہو لی کہارو
چلو لے چلو میری ڈولی کہارو

ٹالسٹائے کا کمال یہ ہے کہ اور لکھنے والوں کے برعکس جو جسمانی رشتے کے بیان پر صفحوں کے صفحے لکھتے چلے جاتے ہیں، ایک لفظ بھی اس ذکر پر طابع کیے بغیر ایک بہت گہرا تاثر پیدا کر دیا ہے اور یہی کمال رنگین نے اس شعر میں کیا ہے۔ کیا حسنِ ادا، لہجے کے درد اور اپنے تاثر کے اعتبار سے یہ شعر ادب عالیہ کی سرحد نہیں چھو لیتا۔

درد کی یہ شدت تو ہر اُس محبت کا مقدر ہوتی ہے جہاں چاہنے والے اخلاقی اقدار کا احترام کرنے کے باوجود دل کی پکار پر معاشرتی حد بندیوں کو عبور کر جاتے ہیں، اگر کوئی اخلاقی وابستگی نہ ہو تو کسی قسم کا رنج بھی نہیں ہوتا، اور اگر محبت کرنے والے ایسے خوش نصیب ہوں کہ اخلاقی قدروں کا پاس رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے منسلک ہو جائیں تو پھر ڈولی میں آمد و رفت کے لیے کہاروں کو رازدار بنانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ پھر تو بابل خود ڈولا اُٹھوانے پر مجبور ہو جاتا ہے اور جانے والی صرف "بیرن کی پچھاڑ" کا غم لے کے رخصت ہو جاتی ہے اور جب یہ صورت حال ہو اور عاشقی کو قیدِ شریعت سے مقید کر دیا جائے تو پھر دوسرے قسم کی پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں محبت اپنا رنگ لائے بغیر نہیں رہتی۔

"جلوہ کثرتِ اولاد دکھا جاتی ہے" اور اس طرح بہت سے معاشرتی اور معاشی مسائل کا باعث بن جاتی ہے۔

رنگین کی غزل کا ذکر شروع ہو گیا ہے تو مقطع بھی سن لیجیئے۔

ذرا گھر کو رنگیں کے تحقیق کر لو
یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

محبت کا حق ادا کرنے والی دکھیا کو یہ بھی فکر ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جانے کو تو وہ اپنے چاہنے والے کے گھر پہنچ جائے لیکن واپسی کا کرایہ ادا کرنے کے لیے اُس کے پاس پیسے نہ ہوں، اور وہ اپنے رنگین سے کچھ مانگ کے خود بھی شرمندہ ہو اور اُسے بھی شرمندہ کرے اس شعر میں اُسی طرح کی نزاکت نظر آتی ہے جیسی زہرِ عشق میں محبت کی خاطر جان دینے والی رخصت ہونے سے پہلے محبوب کے لیے پان بنا کر کمالِ وضعداری کا ثبوت دیتی ہے۔

پان کل کے لیے لگاتے جائیں
یاد اپنی تمہیں دلاتے جائیں

جان جانے کا اُسے اتنا غم نہیں ہے جتنا اس بات کا کہ کل اس کے لیے اس محبت سے پان بنانے والا کوئی نہ ہوگا۔ محبت کی خاطر طرح طرح کے خطرے مول لینا تو ہر اُس معاشرے میں عورت کا مقدر ہے جہاں ہر طرف روایات کے پہرے لگے ہوں، چاہنے والا تو اس کے گھر آ نہیں سکتا، اُسے ہی کسی نہ کسی طرح اس تک پہنچنا ہوتا، کبھی چھپتی چھپاتی پیدل نکل جاتی ہے، کبھی ڈولی میں،

کبھی رکشا میں، کبھی ٹیکسی میں، اور جا کے ملتی کہاں ہے، کسی درخت کے نیچے، کسی مکان کے پیچھے، کسی ریسٹوراں میں، کسی ہوٹل کے کمرے میں، اور بہت خوش نصیب ہوئی تو اپنے رنگین تک جا پہنچتی ہے۔ اور اگر حیا مانع آجائے یا خطرات سخت ہوں اور وہ غریب نکلنے کی ہمت نہ کر سکے تو کمبخت چاہنے والا اس قسم کے طعنے دینے پر اُتر آتا ہے۔

لیلیٰ بدشت آمدہ، شیریں بہ بیستوں
پابندِ احتیاط چرائی۔ بیا، بیا

لیلیٰ دشت میں آگئی۔ شیریں بیستوں تک پہنچ گئی۔ تو اس قدر محتاط کیوں ہے کہ گھر سے نہیں نکلتی یہ بے چاری اس بے شرم سے یہ نہ پوچھے گی کہ تو نے مجنوں کی طرح کس دشت کی خاک چھانی ہے، تو نے فرہاد کی طرح کس پہاڑ کا جگر چاک کیا ہے کہ میں بیتاب ہو کر گھر سے نکل آؤں۔ مرد تو اتنے بے غیرت ہوتے ہیں کہ اگر چاہنے والی سب خطرے مول لے کے کسی سہیلی کے ہاں جانے کے بہانے سے رات بھر کے لیے آجائے اور دوسرے دن کچھ اضمحلال کے سبب یا خیالوں میں ڈوب جانے کی وجہ سے جانے میں دیر کر دے تو دھٹائی سے پوچھتے ہیں۔

اب صبحِ شب وصل ہے گھر کیوں نہیں جاتے
کس سوچ میں ہو، رشکِ قمر کیوں نہیں جاتے

اور جب وقت بدلتا ہے تو صدیوں سے مرد کی استحصالی روش کا نشانہ بننے والی عورت اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لیے عصمت چغتائی بن کے اُٹھ کھڑی ہوتی، اور زبان کا وہ ہتھیار جس سے ساس بہوئیں ایک دوسرے کو لہولہان کیا کرتی تھیں ایک ہتوڑے کی طرح معاشرے پر برسانا شروع کر دیتی ہے، اور وہ قیامت ڈھاتی ہے جیسے پورے نظام کو درہم برہم کر دے گی۔ اس بغاوت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی ہمدردی سے بھی چنگاریاں اُڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ فرطِ محبت میں اپنے بھائی کو دوزخی قرار دیتی ہے، اور پھر شاید جب وقت گزرنے کے ساتھ اُسے اپنی زیادتی کا احساس ہوتا ہے تو اس کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اپنے جسم کو دوزخ کی سوغات آگ میں جھلسا دینے کی وصیت کر کے خاموش ہو جاتی ہے، یا شاید بغیر وصیت کے ہی جل کے بھسم ہو جاتی ہے۔ وہ قبر کی تنگ کوٹھری کو قبول نہیں کرتی۔ دیکھئیے غالب نے کس طرح ڈیڑھ سو سال پہلے عصمت کو اس وصیت یا اس انجام کا رستہ دکھایا تھا۔ وہ اپنی ایک فارسی غزل میں کہتے ہیں۔

نعشِ مرا بسوز، کم از برہمن نیم
ننگِ نسوختن نتواں در مزار برد

مری نعش کو جلا کے خاکستر کر دے کہ میں اپنے کفر میں کسی طرح برہمن سے کم نہیں ہوں۔ نہ جلائے جانے کے داغ کے ساتھ دفن ہونا مجھے گوارا نہیں ہے۔

منظوم ترجمہ۔

کیا کم ہوں برہمن سے جلا میری خاک کو
دفنِ جسد سے ہو نہ مرا کفر شرمسار

کیا عجیب و غریب پہنائی ہے صنفِ غزل کی کہ وہ رنگین کی پردہ دار محبوبہ کی ڈولی سے لے کر عصمت پردہ در کی وصیت تک ہر چیز کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے، بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی۔ یہ خیال کے آزاد بہاؤ کا نتیجہ ہے، رو میں ہے رخشِ فکر کہاں

دیکھیئے تھے، میں نے جب ریختی کے بارے میں جوش صاحب سے استفسار کیا تھا تو میرے ذہنی پس منظر میں انسانی زندگی کا ایک المیہ تھا۔ مجھے خیال تھا کہ جوش صاحب جو ایسے صاحبِ احساس ہیں کہ شعر سے دل گرفتہ ہو کر آنسو بہانے پر مجبور ہو جاتے ہیں ضرور رنگین کی غزل سے متاثر ہوں گے۔ لیکن وہ ایک اور ہی عالم میں تھے۔ بابا صاحب کی محفل اور فارسی کے عارفانہ کلام نے اُنھیں کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ وہ لکھنؤ کی ثقافت سے بہت دور جا نکلے تھے ریختی کے اشعار اُن کے لیے بے وقت کی راگنی بن گئے تھے۔ جب غزل ختم ہوئی تو ایسا لگا کہ ایک گناہِ بے لذت سے چھٹکارا ملا۔

آدھے گھنٹے بعد جب بابا صاحب آئے تو جوش صاحب اُن سے باتوں میں مشغول ہو گئے۔ ڈھائی تین بجے دوپہر میں محفل ختم ہوئی۔ اُس رات میں نے خواب میں بابا ذہین شاہ صاحب کو دیکھا۔ اس طرح کہ وہ آئے اور بہت بے اعتنائی سے مجھے نظر انداز کر کے کسی اور کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ایک لفظ بھی انھوں نے اپنی زبان سے ادا نہ کیا اور اس خاموش بے رخی سے مجھے بیقرار کر کے چلے گئے۔ دوسرے دن اس خواب سے میں بہت تکلیف میں رہا۔ بار بار یہ خواب یاد آتا تھا اور کافی اذیت ہوتی تھی۔ بابا صاحب سے اس خواب کا ذکر کرنے کی ہمت بھی نہ ہوتی تھی۔ بالآخر رات کو اس خواب کی تعبیر سمجھ میں آ گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے بابا صاحب کی عدم موجودگی میں اُن کی محفل کے تقدس کو مجروح کیا ہے، جس جگہ رومی، سعدی اور حافظ کا کلام سنایا جاتا تھا وہاں میں نے ریختی کی فرمائش کی تھی۔ اس تعبیر کے ذہن میں آتے ہی میری ساری تکلیف دور ہو گئی۔ دوسرے دن میں بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ بہت معنی خیز انداز میں مسکرائے اور بڑی شفقت سے پیش آئے۔ میں مطمئن ہو گیا اور میں نے اپنی اس غلطی کو جوش صاحب کے کھاتے میں ڈال دیا۔

دوسرا سانحہ تین چار سال بعد پیش آیا۔ بابا صاحب بہار کالونی میں اپنے پُرانے گھر میں منتقل ہو گئے تھے۔ یہ بات شاید بابا صاحب کے وصال سے ایک سال پہلے کی ہے۔ اُن کے ہاں جوش صاحب کے اعزاز میں دوپہر کے کھانے کا انتظام تھا۔ اس دفعہ سماع کے لیے قوالوں کو نہیں بلایا گیا تھا۔ جوش صاحب کے ساتھ اُن کے کچھ دوست بھی مدعو تھے۔ یہ محفل اُن محفلوں سے ذرا مختلف تھی جن میں مجھے جوش صاحب کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ نہ انھوں نے خدا کا شکوہ کیا، نہ زمانے کا گلہ، نہ کسی کے مسلک پر اعتراض، بہت متوازن انداز میں باتیں کرتے رہے۔ کھانے کے بعد انھوں نے بابا صاحب سے کہا کہ وہ جب اسلام آباد سے لاہور جاتے ہیں تو انھیں ایک عجیب مشکل سے سابقہ پڑتا ہے، وہاں ایک لڑکی جس کی عمر صرف اٹھارہ اُنیس سال کی ہو گی اور جسے ادب سے ذوق ہے اور ان کے کلام کی بہت قدر دان ہے انھیں گھیر لیتی ہے، ان سے اٹھلاتی ہے اور صاف اعلان کرتی ہے کہ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے، وہ مشفقانہ انداز میں اس سے بات کر کے سمجھاتے ہیں کہ ان کے اور اُس کم سن کے درمیان محبت کی کیا تک ہے وہ کہتی ہے محبت کا عمر سے کیا تعلق۔ بس جو دل میں بس گیا وہی محبوب ہے، میں اُسے لاکھ سمجھاتا ہوں، لیکن وہ کسی طرح نہیں مانتی۔

میں خاموش دیر سے جوش صاحب کی باتیں سُن رہا تھا۔ یہ سنتے ہی میں بڑے اشتیاق سے اس گفتگو میں شامل ہو گیا۔ اس نو عمر لڑکی کی جوش صاحب میں دلچسپی میں مجھے بڑے ڈرامائی امکانات نظر آئے ممکن تھا کہ اُن کا یہ آخری عشق اُن کے اٹھارہ معاشقوں سے کہیں زیادہ معنی خیز ثابت ہوتا میں نے کہا جوش صاحب اُس میں حرج ہی کیا ہے اس غریب کا دل نہ توڑیے۔ جوش صاحب میری طرف مُڑے اور کچھ ناصحانہ انداز میں اپنے گلے کی جلد کو ہاتھ لگا کے بولے۔ ""بیل کی طرح میرے گلے کی کھال لٹک گئی ہے، سر پر بال برائے نام رہ گئے ہیں اب میں اس حُلیے میں ایک نوجوان لڑکی سے محبت کروں گا۔"" میں نے کہا کہ، یہ حلیہ اس

سے پوشیدہ تو نہیں ہے۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے محبت کر رہی ہے تو آپ کو اس میں کیوں اعتراض ہے، یہ دیکھ کر کہ میں جوش صاحب کو اس آخری محبت پر آمادہ کرنے پر تُلا ہوا ہوں بابا صاحب نے اُن کی تائید کرتے ہوئے کہا "آپ اُس لڑکی کو اس نادانی سے باز رکھیں، بابا صاحب کے یہ کہنے کے بعد مجھے خاموش ہو جانا چاہیے تھا، لیکن معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا کہ میں اس کے باوجود اس آخری محبت کے محاسن گناتا رہا۔ جب جوش صاحب کسی طرح راضی نہ ہوئے تو مجھ سے اور بڑی غلطی سرزد ہوئی۔ میں بابا صاحب کے کُتب خانے سے دیوانِ حافظ لے آیا۔ میں نے کہا، اچھا جوش صاحب آپ میری بات نہیں مانتے تو لسان الغیب پر فیصلہ چھوڑ دیجیئے۔ یہ کہہ کر میں نے فال نکالی۔ ایسا سخت شعر نکلا کہ میں نے گھبرا کے ہتھیار ڈال دیے۔ بابا صاحب عجیب نظروں سے میری یہ حرکتیں دیکھتے رہے۔ جب میں دیوانِ حافظ رکھ کے واپس آیا تو بابا صاحب نے مجھ پر ایک ایسی نظر ڈالی کہ میرے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ اس تادیب کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ رات کو جب میں نے اپنے بستر پہ لیٹ کے ان سب باتوں کا جائزہ لیا تو میری سمجھ میں آگیا کہ بابا صاحب کیوں جوش صاحب کو اس غلطی سے باز رکھنا چاہتے تھے۔ اگر کہیں جوش صاحب کوئی بے احتیاطی کرتے اور ان کا یہ آخری معاشقہ مشہور ہو جاتا تو وہ غریب لڑکی ایسی بدنام ہوتی کہ شاید کہیں سے اس کا رشتہ ہی نہ آتا۔ اس کے گھر والے الگ ایک عذاب میں مبتلا ہوتے۔ اگر اخبار والوں کو اس کی بھنک پڑ جاتی تو وہ جوش صاحب کے لتّے لے ڈالتے اور ممکن تھا کہ ان کی سرکاری ملازمت خطرے میں پڑ جاتی۔ مجھے حیرت سب سے زیادہ خود اپنے غیر ذمہ دارانہ رویّے پر ہوئی کہ بابا صاحب کے صاف ارشاد کے باوجود میں کس طرح غلطی پر غلطی کرتا چلا گیا اور پھر کس طرح بابا صاحب کی نگاہ کے تازیانے سے میرے حواس درست ہوئے۔ اُس وقت مجھے اقبال کے اس مصرعے کی معنویت کا ادراک ہوا۔ "وہ ادب گہہ محبت" وہ نگہہ کا تازیانہ" مجھے دس سال تک بابا صاحب کے بہت قریب رہنے کی سعادت حاصل رہی، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ میں ایسی کوئی بات کرتا جو اُن کی مرضی کے خلاف ہوتی۔ یہ جوش صاحب کی منفرد شخصیت کا اثر تھا، کہ میں نے تمام آدابِ ارادت کو بالائے طاق رکھ کے اس قسم کی جسارت کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جوش صاحب نے ابلیس و ابوجہل کی عظمت کی جو قسم کھائی ہے وہ اپنا اعجاز دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ جوش صاحب خود کچھ نہیں کرتے، مگر اس قسم کا تصرف خاموشی سے اپنا کام کیے جاتا ہے۔

مجھ سے قریبی تعلق رکھنے والے ایک صاحب نے جب "قومی زبان" میں یادوں کے سفر کی پہلی قسط پڑھی تو جوش صاحب کے اس مصرعے نے ان پر جادو کا اثر کیا۔

"ابلیس و ابوجہل کی عظمت کی قسم" وہ بار بار یہ مصرعہ دہراتے رہے، کراچی جیم خانہ کلب میں ہر شعر کا ذوق رکھنے والے کو یہ مصرعہ سنایا اور اُس سے اس طرح داد لی کہ جوش صاحب کی روح خوش ہو گئی ہو گی، اور خود اس طرح داد دی کہ جیم خانہ کلب کے مہمان خانے میں رات گزاری، ایک سحر افزا شراب کو آہستہ آہستہ پیتے ہوئے یہ مصرعہ گنگناتے رہے اور اسی کیف میں سو گئے۔ صبح جلد بیدار ہوئے تو کلب کے قریب پولیس لائنز کی مسجد میں جماعت سے نماز ادا کی اور وہی مصرعہ گنگناتے ہوئے مسجد سے نکل آئے۔ غضب کا ملاحظہ تھا ابلیس بھی۔ خدائے واحد کو سجدہ کرنے سے اُسے کب انکار تھا کہ اُس کی عظمت کا عرفان کسی اور کے لیے مانعِ سجدہ ہوتا۔

جوش صاحب اور بابا صاحب کی ملاقاتوں میں شیعہ سُنّی عقاید سے متعلق بھی دلچسپ باتیں ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ بابا صاحب کے ہاں محفل سماع میں شاہ نیاز کی منقبت اس مقطع پر ختم ہوئی۔

نیاز اندر قیامت بے سروساماں نخواہی شد

کہ از حُبّ و تولائے علیؓ داری تو سامانے

(نیاز تو حشر میں بے سروسامانی کے عالم میں نہیں اُٹھے گا، اس لیے کہ تو حضرت علیؓ کی محبت کی دولتِ بے بہا سے مالامال ہے)

منقبت کے ختم ہونے پر جوش صاحب نے خاصی بلند آواز سے کہا، بابا صاحب۔ یہ صوفیائے کرام اپنے کلام میں حضرت علیؓ کی محبت کا بہت دم بھرتے ہیں، لیکن کبھی کھُل کر بھرے مجمعے میں اُن کے مقام کا اعلان نہیں کرتے۔ بابا صاحب نے جواب آہستہ آواز میں دیا، بات یہ ہے کہ صوفیا کو براہ راست حضرت علیؓ سے فیض حاصل ہوتا ہے، وہ اُن سے عشق کی نسبت رکھتے ہیں اور یہ رشتہ آپ کے معاشقوں سے کچھ مختلف ہوتا ہے، یہ اسی محفل کی بات ہے جس میں جوش صاحب پر رقت طاری ہوگئی تھی۔ ممکن ہے جوش صاحب کی اشک ریزی میں اس جواب کا تاثر بھی شامل ہو۔ جس شعر پر جوش صاحب کی کیفیت متغیر ہوئی تھی وہ یہ تھا۔

رفتم اندر تہ خاک عشقِ بتانم باقیست
عشق جانم بربود، آفتِ جانم باقیست

ایک دفعہ جوش صاحب کچھ بپھرے ہوئے آئے شاید کسی مولوی سے مڈبھیڑ کے بعد آئے ہوں گے اور آتے ہی برس پڑے، اور برستے ہی قرآنِ کریم کی سب سے مختصر سورت پڑھ کر کہتے ہیں "ہم نے آپ کو کوثر عطا کی۔ واہ کیا عطا ہے۔ آپ ربّ العالمین ہیں، آپ کی ساری رحمتیں صرف ایک فردِ واحد کے لیے۔ اور کیا ہے آپ کی کوثر، ہمارے لیے تو ہر جام جامِ کوثر ہے۔" میں اس محفل میں شریک نہیں تھا۔ جو لوگ موجود تھے انھوں نے بتایا کہ یہ سن کر بابا صاحب کا چہرہ سرخ ہوگیا، وہ حضورؐ کی شان میں کوئی گستاخی نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ انھوں نے کہا، جوش صاحب ہوش میں آئیے۔ آپ کوثر کو صرف ایک نہر یا حوض سمجھے ہوئے ہیں۔ اس کے معنی ہیں خیرِ کثیر۔ اور جس خیرِ کثیر سے حضورؐ کو نوازا گیا ہے وہ آپ کے اہلِ بیت ہیں، جن سے امامت اور ولایت کا فیض جاری ہوا، اور یہ فیض قیامت تک جاری رہے گا۔ یہ سُن کے جوش صاحب پر ندامت طاری ہوئی اور وہ خاموش ہو کے بیٹھ گئے۔

جوش صاحب ایک بار بابا صاحب سے ملنے کے لیے آئے تو اُن کے ایک سُنّی رشتہ دار جن کا نام فاروق تھا ان کے ساتھ تھے۔ وہ اُن کو برآمدے میں چھوڑ کر بابا صاحب کے پاس اندر کمرے میں چلے گئے۔ جب گفتگو لمبی ہوئی تو انھوں نے سوچا انھیں بھی اندر ہی بلالیں۔ چنانچہ فاروق، فاروق پکار کے انھیں آواز دی۔ بابا صاحب نے اس نام کی تکرار سن کر جوش صاحب سے کچھ حیرت سے پوچھا۔ "آپ کے ساتھ؟" جوش صاحب کچھ نہ سمجھے، پھر جب بابا صاحب کے استفسار کا مطلب اُن کی سمجھ میں آگیا تو ایک زوردار قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستے رہے جیسے یہ کہہ رہے ہوں کہ "آپ کی محفل میں جو کچھ نہ ہو کم ہے۔"

شاید ایسی ہی کسی صورتِ حال کے لیے رومی نے کہا تھا۔ "ہم علیؓ و ہم عمرؓ آمیختند"

ایک روز شیخ عبدالرشید صاحب کو جو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ کے بہت ممتاز پروفیسر تھے میں نے نیپا میں سلاطینِ دہلی کے نظم و نسق پر لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا تھا۔ لیکچر کے بعد وہ میرے کمرے میں تشریف لے آئے اور دیر تک علیگڑھ اور تقسیم ہند سے پہلے کے واقعات کا ذکر کرتے رہے۔ اس ملاقات میں پہلی بار مجھے ادب سے اُن کی دلچسپی کا اندازہ ہوا۔ ابنِ انشاء کی تحریر کے بارے میں اندرا گاندھی کے تاثر کا اُن سے علم ہوا۔ پھر وہ جوش صاحب کے بارے میں گفتگو کرنے لگے اور اُن کے عقائد کے بارے میں جو لطیفہ انھوں نے سنایا وہ لاجواب ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب جوش صاحب سے کسی نے پوچھا "آپ مسلمان ہیں؟" تو انھوں نے بے ساختہ جواب دیا "نعوذ باللہ" اور جب پوچھا "شیعہ تو آپ ہیں نا؟" تو انھوں نے بڑے فخر سے کہا

"الحمدللہ" جوش صاحب کے عقائد کے بارے میں یہ جوابات شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں، ان پر لکھنے والوں نے ان کا ذکر کیا ہوگا، ممکن ہے جوش صاحب نے خود بھی کہیں تذکرہ کیا ہو۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو یہ شعر بہت پسند تھا۔

دو دل بودن دریں رہ سخت ترعیبے ست سالک را
خجل ہستم ز کفرِ خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

اس راہ میں دو دل ہونا سالک کے لیے بہت بڑا عیب ہے۔ میں اپنے کُفر سے شرمندہ ہوں کہ اس میں ابھی تک بوئے ایماں باقی ہے۔

جوش صاحب نے جس طرح اپنے کفر پر ایمان کی شرط لگائی ہے اس کے پیش نظر اس شعر میں حسبِ ذیل ترمیم کی جاسکتی ہے۔

دو دل بودن دریں رہ ہیچ نقصانے نمی دارد
مگر نازم بکفرِ خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

کفر پر ناز کرنے کے سلسلے میں حرف آخر تو غالب کا یہ شعر ہے

گفتم حدیثِ دوست بُقراں برابر است
نازم بہ کُفر خود کہ یہ ایماں برابر است

میں نے صاف کہا کہ میرے دوست کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ قرآن کی طرح ہیں۔ یہ کہہ کر میں نے کفر تو کیا ہے، لیکن مجھے اس بات پر ناز ہے کہ میرا کفر کسی طرح ایمان سے کم نہیں ہے۔

کس غضب کا شعر کہا ہے غالب نے۔ جیسے چاہیں اسے پڑھیں، نعت میں پڑھیں تو کیا کہنے، منقبت میں پڑھیں، عشق کی وارفتگی کی داستان سمجھ کے پڑھیں، کسی صورت میں اس کا لطف کم نہ ہوگا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کمال کا شعر اور ایسا غیر معروف، آخر کیوں۔ سبب یہ ہے غالب نے اس شعر سے بہادر شاہ ظفر کی شان میں قصیدے کا آغاز کیا ہے، قصیدہ کون پڑھے گا۔ غالب کے کمالِ فن کی تلاش قصیدوں میں بھی کرنا پڑے گی۔

جوش صاحب اور باباصاحب کے تعلقات کے بارے میں مجھے "پہچان" کے مدیر فرید احمد صاحب نے ایک دلچسپ بات بتائی۔ ایک دفعہ جوش صاحب کو روپے کی سخت ضرورت ہوئی۔ وہ باباصاحب کو اپنے ہر درد کا مداوا سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ اُن کے پاس گئے۔ باباصاحب کے پاس اس وقت کچھ نہ تھا۔ جوش صاحب بہت مایوس ہوئے۔ باباصاحب نے اپنے ایک خاص مرید سے کہا کہ جوش صاحب کے لیے مطلوبہ رقم کا انتظام کردو۔ چنانچہ انھوں نے فوراً ایک چیک پیش کر دیا۔ جوش صاحب نے قرض کے طور پر وہ رقم لی۔ کچھ عرصے بعد جوش صاحب قرض واپس کرنے کے لیے آئے تو باباصاحب نے رقم لینے سے یہ کہہ کے انکار کر دیا کہ انھوں نے جوش صاحب کو کوئی قرض نہیں دیا۔ پھر باباصاحب کے خاص مرید کو بلوایا گیا جنھوں نے چیک دیا تھا۔ انھوں نے بھی یہی کہہ کے روپیہ لینے سے معذرت کر دی۔ فرید احمد نے بتایا کہ یہ واقعہ مولانا رزی جے پوری نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے، جس رسالے میں مضمون شائع ہوا تھا، وہ دستیاب نہ ہوسکا۔ فرید صاحب نے یہ بھی بتایا کہ وہ خاص مرید آج کل باباصاحب کے سجادہ نشین ہیں۔

اس واقعے کی تصدیق کے لیے میں نے سلسلہ تاجیہ کے سجادہ نشین بابا انور شاہ صاحب سے استفسار کیا۔ انھوں نے کہا مجھے یاد نہیں کہ جوش کو باباصاحب نے مجھ سے کوئی رقم دلوائی تھی، باباصاحب کے پاس بہت سے لوگ آتے تھے جن میں بعض ایسے بھی

ہوتے تھے جنھیں کچھ ضرورت ہوتی تھی۔ کسی کو روپے کی، کسی کو ملازمت کی۔ میں بابا صاحب کے حکم کے مطابق جو کچھ مجھ سے ہو سکتا تھا وہ کر دیتا تھا۔ لیکن میں نے کبھی بھی قرض سمجھ کے کسی کو رقم نہیں دی۔ اس کے علاوہ پیر کے حکم پر عمل کرنا تو فرض ہے۔ اُسے قرض کون سمجھ سکتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد انھوں نے ایک دلچسپ بات بتائی۔ کہنے لگے جس زمانے میں، میں بمبئی میں پڑھتا تھا تو میں نے اسکول کی کینٹین کی عمارت پر گجراتی میں یہ تحریر لکھی ہوئی دیکھی تھی "اُدھار دینے سے رقم بھی ڈوبتی ہے، دوستی بھی۔" یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ میں نے کبھی کسی کو روپے قرض سمجھ کے نہیں دیے۔ اس لیے یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہی نہ ہوئی کہ کس کو دیا اور کتنا دیا، جوش صاحب کے بارے میں یہ البتہ ضرور یاد ہے کہ اُن کے آنے پر جب بابا صاحب مشاعرہ کرواتے تھے تو اس کا سارا انتظام میں کرتا تھا۔

فرید احمد کی کوشش بار آور ہوئی اور انھوں نے رزی صاحب کے مضمون کی کاپی حاصل کر کے مجھے دے دی۔ اب یہ روئیداد اُن ہی کی زبانی سنیئے۔

"ایک روز جوش صاحب نے ذہین صاحب کے پاس آتے ہی کہا کہ اس وقت مجھے پچیس ہزار روپے کی اشد ضرورت ہے۔ ذہین صاحب نے کہا، چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ میرے پاس پچیس ہزار روپے ہوتے تو میں بیاہ نہ کر لیتا، یہ خشک جواب سن کر جوش صاحب کا منہ اُتر گیا اور اضطراری طور پر ان کے منہ سے نکلا کہ "پھر اب کیا ہوگا" ذہین صاحب نے ان کی کیفیت کا اندازہ لگا کر کہا "کچھ نہ کچھ تو ہو ہی جائے گا" اور آواز دی "ارے بھئی، کوئی ہے، ادھر آنا" اس آواز پر انور پیر بھائی صاحب (ذہین صاحب کے موجودہ جانشین انور شاہ تاجی) لپکے ہوئے حاضر ہوئے اور دست بستہ گردن جھکا کے کھڑے ہو گئے۔ حضرت ذہین نے جوش صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا "ان کو پچیس ہزار روپے کی ضرورت ہے" جوش صاحب نے اس کی تشریح میں کہا کہ "قرض چاہیے،" انور پیر بھائی صاحب یہ سن کر باہر چلے گئے اور پانچ منٹ بعد ہی پچیس ہزار روپے کا چیک جوش صاحب کو پیش کر دیا۔

کم و بیش ایک سال بعد جب جوش صاحب آئے تو اپنے "مخزن بلاغت" (وہ اپنے بریف کیس کے لیے جس میں وہ اپنی بیاض اشعار رکھتے تھے یہی اصطلاح استعمال کرتے تھے) سے پچیس ہزار کے نوٹ نکال کر حضرت ذہین کے سامنے رکھے دیے۔ ذہین صاحب نے کہا "کیا بات ہے، آج تو روپیہ نالی میں بہتا نظر آ رہا ہے" جوش صاحب نے کہا "یہ وہ قرض ہے جو میں آپ سے لے گیا تھا" اور اس پر یہ اضافہ کیا کہ "اگرچہ مجھ میں انگنت عیوب ہیں مگر ہندوستان یا پاکستان میں کوئی ایک بھی ایسا شخص نہیں ملے گا کہ جس کے دس بیس روپے بھی مجھ پر قرض ہوں، ذہین صاحب نے فرمایا "خیر مگر میں نے تو آپ کو کوئی رقم قرض نہیں دی، اس پر جوش صاحب نے یاد دلایا کہ آپ ہی کے حکم پر تو ایک صاحب نے پچیس ہزار کا چیک مجھے آپ کے سامنے دیا تھا۔ انھیں بلایے تو میں یہ رقم شکریہ کے ساتھ اُن کی خدمت میں پیش کر دوں، یہ سن کر ذہین صاحب نے آواز دی تو اتفاق سے انور پیر بھائی صاحب ہی حاضر ہوئے۔ جوش صاحب نے ان سے فرمایا "بھئی یہ اپنے پچیس ہزار روپے گن لیں میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ بڑے آڑے وقت میں کام آئے" ذہین صاحب نے ان سے استفساراً فرمایا "یہ روپیہ تم نے جوش صاحب کو دیا تھا۔" تو انھوں نے جواب دیا "سرکار کا حکم تھا" جوش صاحب نے اُن سے پھر کہا "بھئی یہ اپنا روپیہ لے لیجیئے" انھوں نے جوش صاحب سے کہا "میں آپ کو نہیں جانتا تو میں آپ کو قرض کیوں دینے لگا" جوش صاحب نے انھیں پھر بطور یاددہانی کہا کہ "ارے بھائی، حضرت کے سامنے ہی تو آپ نے پچیس ہزار کا چیک مجھے دیا تھا، یہ وہی روپیہ ہے" یہ سنتے ہی انور پیر بھائی صاحب واپسی کے لیے مُڑے۔ جوش صاحب "ارے بھائی۔ ارے بھائی کہتے رہے لیکن انھوں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔

میں نے نوٹوں کی گڈیاں اُٹھائیں اور جوش صاحب کے "مخزن بلاغت" میں واپس رکھنا شروع کر دیں۔ جوش صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ذہین صاحب سے مخاطب ہو کے کہا "حضرت ان صاحب کو بلوائیں اور حکم دیں کہ اپنی رقم واپس لے لیں ورنہ ہم اس کی پی جائیں گے۔" میں نے اپنا ہاتھ چھڑا کر رقم "مخزن بلاغت" میں رکھ دی اور کہا "جوش صاحب، ہوش کے ناخون لیجیئے یہاں کوئی سیٹھ بیٹھا ہے جو ضرورت مندوں کو قرض دیتا ہے اور آپ جیسے شخص کو کوئی زکواۃ یا خیرات دینے سے رہا" اس واقعے سے جہاں حضرت ذہین اور جوش صاحب کے باہمی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے وہیں جوش صاحب کی خوش معاملگی اور شرافت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔"

رزی صاحب کی زبانی آپ نے جوش صاحب کی خوش معاملگی کا ماجرہ سن لیا۔ اب ایک "خوشتر معاملگی" کا واقعہ بھی سنئیے چند سال پہلے مجھے ایک پولیس افسر ملے ڈی آئی جی کے عہدے سے ریٹائر ہو کر کراچی آئے تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ جس زمانے میں میرے بڑے بھائی مدنی صاحب کراچی کے کمشنر تھے تو وہ ایک دن اُن سے ملنے کے لیے گئے۔ وہاں جوش صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ مدنی بھائی نے اُن سے کہا۔ "اچھا ہوا آپ آ گئے۔ جوش صاحب کو اُن کا مالکِ مکان بہت تنگ کر رہا ہے، یہ ہمارے مایۂ ناز شاعر ہیں۔ اگر ہم جوش صاحب کے لیے کچھ نہ کر سکے تو یہ ہمارے لیے بڑی شرم کی بات ہوگی۔ یہ معاملہ میں آپ کے سپرد کرتا ہوں" چنانچہ انھوں نے جوش صاحب سے اُن کے گھر کا پتہ سمجھ لیا اور دوسرے دن ان کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ دو منزلہ مکان تھا۔ بالائی منزل میں جوش صاحب کا قیام تھا۔ وہ اُن کے منتظر تھے۔ جوش صاحب نے اور اُن کے اہلِ خانہ نے بہت تفصیل سے مالک مکان کی زیادتیوں کا ذکر کیا۔ وہ بہت ہمدردی سے اُن کی باتیں سنتے رہے، اور ڈیڑھ گھنٹے بعد یہ کہہ کے رخصت ہوئے کہ وہ کمشنر صاحب کو پوری روئیداد سنا دیں گے اور پھر ان کی ہدایت کے مطابق ضروری کارروائی کریں گے۔ جب وہ نیچے اتر کے اپنی جیپ میں بیٹھنے لگے تو مالک مکان جو ایک مسکین سا میمن تاجر تھا ان کے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ اُن کے پاس آیا اور کہنے لگا "آپ جوش صاحب کی شکایت سننے کے لیے آئے ہو" انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو اُس نے التجا کی "آپ ہماری بھی بات سن لو" تفتیش کے سلسلے میں اُس کا بیان لینا تو ضروری تھا، اس لیے وہ فوراً اس کی بات سننے پر آمادہ ہو گئے۔ جب وہ اُس کے گھر میں آئے تو اس نے کہا "آپ کو ہماری بات کا تو یقین نہیں آئے گا، آپ ساری بات جوش صاحب کی آواز میں سن لو" یہ کہہ کر اس نے اپنا ٹیپ ریکارڈر چلا دیا ٹیپ میں جو گفتگو محفوظ تھی اُس میں بے چارے مالک مکان کی مری ہوئی آواز تو کہیں کہیں سنائی دیتی تھی، سارے ٹیپ پر جوش صاحب اور ان کے اہلِ خانہ چھائے ہوئے تھے، وہ ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکیاں تھیں کہ انھیں سن کر افسر تفتیش، کراچی کے ایس پی کا دل مظلوم مالکِ مکان کے لیے ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ وہ اس کی حفاظت کا وعدہ کر کے روانہ ہوئے اور مدنی بھائی کو جا کر پوری روئیداد سنائی۔ وہ حالات کے اس تضاد پر حیران رہ گئے اور اس طرح بغیر کسی کارروائی کے جوش صاحب کی شکایت کی مثل داخل دفتر ہو گئی۔ البتہ یہ فیصلہ ضرور ہو گیا کہ غریب مالکِ مکان کی خیریت سے پولیس اپنے آپ کو مطلع رکھے۔

چند دن ہوئے جوش صاحب پر میں نے بابا ذہین شاہ صاحب کا ایک شعر سنا جسے اُن کی انفرادیت کو سند کہا جا سکتا ہے، وہ مومنوں میں بھی ممتاز نظر آتے ہیں اور کافروں میں بھی۔

جوش میں ہم نے جو دیکھی ہے عجب بات ذہین
کافروں میں نظر آئی نہ مسلمانوں میں

بابا صاحب کا رویہ جوش صاحب کی طرف اُس شفقت اور خصوصی توجہ کا مظہر تھا جس سے خاندان کے بزرگ ضدی، نادان اور ذہین

بچوں کو نوازتے ہیں یہ شفقت خاص طور پر اس تصویر میں نظر آتی ہے جس میں باباصاحب نے بہت محبت سے جوش صاحب کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیا ہوا ہے۔

باباصاحب نے اپنے رسالے "تاج" کی اگست سنہ ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں جوش صاحب کا جو عرس کے مشاعرے میں شریک ہوئے تھے ان الفاظ میں تعارف کرایا ہے۔

"آپ سے ملئیے یہ ہیں جناب جوش ملیح آبادی۔ تمام عمر تکمیلِ کفر میں گزارنے کے باوجود کفر میں خام ہیں اور زبانِ حال سے فرمارہے ہیں۔

خجل ہستم زکفر خود کہ دارد بوے ایماں ہم

مجھ سے بڑی محبت اور بے حد خلوص سے ملتے ہیں، غریب خانے پر بھی، خانقاہ میں بھی، خود اپنے مکان پر بھی اور احباب کے یہاں بھی بار بار ملنا ہوا، جب ملا ایسا معلوم ہوا کہ سراپا خلوص اور مجسم محبت ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جس دل میں اخلاص اور محبت ہو اس کو کافر کہنے میں تامل کرنا چاہیے۔ تامل سے معلوم ہوگا کہ اُن کا دل اگر کافر بھی ہے تو ماسوائے محبوب کا کافر ہے، کافرِ محبوب نہیں ہے اور یہ اپنی جگہ پر مسلمہ ہے کہ

ہرچہ آید دردلم غیرے تونیست
یاتوئی یا بوئے تو یا خوئے تو

اور حقیقت یہ ہے کہ سب امور خدا ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہی حال محبت کا ہے، جس سے بھی ہو اُسی سے ہے

عاشقی گرزیں سرو گرزاں سراست
عاقبت ماراباداں شہ رہبراست

مجھ سے کسی نے پوچھا کہ جوش خدا کو نہیں مانتے۔ میں نے کہا کہ "وہ خدا کے ماننے والوں کو مانتے ہیں"

اس نثر کی تشریح باباصاحب کے دو اشعار سے بڑی خوبی سے ہوجاتی ہے۔

بہ فیض بت پرستی تم ذہین اللہ والے ہو
خدا یاد آئے جس کو دیکھ کر وہ آدمی تم ہو

بت پرستی کے فیض سے ہی انسان حق تک پہنچتا ہے، بت چاہے کوئی محبوبِ طرحدار ہو، یا کوئی یارِ غمگسار، یا شیخ کامل عیار۔ دوسرا شعر ہے:

محبت کسی نے کسی سے بھی کی ہو
مگر اس محبت کی غایت ہمیں ہیں

جب طالب حق میں فنا ہو کے اُس کی ذات میں گم ہوجاتا ہے تو وہ ہر محبت کا مرجع بن جاتا ہے۔ اسی لیے وہ کسی محبت کرنے والے کو اپنا غیر نہیں سمجھتا، یہی سبب ہے کہ باباصاحب ان کی صنم پرستی اور بادہ پرستی کے باوجود جوش صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے۔

تاج کی اُسی اشاعت میں جوش صاحب کا ایک مکتوب بھی شامل ہے جس سے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"اب میرا یہ عالم ہے کہ ہرچند خدا کے وجود کا منکر نہیں ہوں اس لیے کہ خدا کے اقرار یا انکار کی جرات کرنے کے لیے جس

بے پایاں علم کی ضرورت ہے وہ میرے پاس نہیں ہے، لیکن ایسا متشکک ہوں کہ قوی ترین براہین کے بغیر میں دنیا و دین کے کسی مسئلے کے مان لینے پر اپنے کو کسی شرط کے ساتھ بھی مائل نہیں کر سکتا۔

چنانچہ اس تشکیک کی وادی میں کم و بیش پچیس تیس برس سے ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہوں اور اب حضرت ذہین شاہ کی طرف اس اُمید میں نظریں اُٹھا رہا ہوں کہ شاید کشودِ کار کی کوئی صورت نکل آئے۔

ہرچند اعمال و عقاید کے لحاظ سے ہم دونوں ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں، میرے روش کے وہ خلاف ہیں، ان کی روش کے میں خلاف ہوں، لیکن یہ ایک عجیب نفسیاتی معجزہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی جانب برابر کھچتے چلے جا رہے ہیں۔

دیکھیئے۔ اس جذب و کشش کا کیا مآل ہوتا ہے۔ نہیں معلوم کیا نیا گل کھلنے والا ہے۔

یا جاں رسد بجاناں، یا جاں زتن برآید"

یہ تحریر سنہ ۱۹۶۲ء کی ہے۔ معلوم نہیں کہ اس سلسلے میں سنہ ۱۹۷۸ء میں باباصاحب کے وصال تک کیا پیش رفت ہوئی۔ اگر میں نے اپنی یادداشتیں کچھ پہلے لکھنا شروع کر دی ہوتیں تو مولانا رزمی جے پوری سے جوان دونوں حضرات کی حد تک گنجینۂ اسرار تھے، بہت کچھ معلوم ہو جاتا۔ صرف چھ مہینے پہلے مولانا کا انتقال ہوا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اُن سے استفادہ نہ کر سکا۔ وہ عجب درویش صفت آدمی تھے، جوش صاحب کے غمگسار اور باباصاحب کے رازدار۔

مجھے اس کا بھی بڑا افسوس ہے کہ گو میں اسلام آباد جاتا رہتا تھا مجھے کبھی جوش صاحب سے وہاں ملنے کی توفیق نہ ہوئی۔ میں اپنے ذہن میں جوش صاحب کو باباصاحب کی محفلوں سے الگ نہیں کر پایا تھا۔

جوش صاحب کے بارے میں آخری اہم خبر اخباروں میں یہ پڑھی تھی کہ اُن کی وفات سے چند دن پہلے جب کسی عبادت کرنے والے نے پوچھا اب آپ کی طبیعت کیسی ہے تو انھوں نے بڑے خسروانہ انداز میں جواب دیا تھا "انتقال فرما رہے ہیں" اس تحمل کے ساتھ کسی نے بھی زندگی کی آخری ساعت کا ذکر نہیں کیا ہوگا اور واقعی جب اُن کی آنکھیں بند ہوئی ہوں گی تو خدا نے اعلان کیا ہوگا کہ ابھی آنکھ لگی ہے۔"

اردو ہندی کے

جدید مشترک اوزان

(ایک تقابلی جائزہ)

از

ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی

قیمت: .... ۷۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

محمد سلیم الرحمٰن

چند خطوط

("نیا ادارہ" میں موجود خطوط کے ذخیرے سے چند خط اور حاضرِ خدمت ہیں۔ حواشی کی کمی قارئین کو کھٹکے گی لیکن سرِدست ان خطوط کی اشاعت زیادہ اہم ہے۔ م س)

۳ منوہر لعل اسٹریٹ،
تیس ہزاری، دہلی

ڈیر نذیر،

حسب وعدہ خط لکھ رہا ہوں۔ ساتھ ہی افسانہ بھیج دیتا لیکن وہ میں نے ابھی تک نقل نہیں کیا۔ جلدی کر دوں گا اور بھیج دوں گا۔

کرشن کو تمھارا عندیہ میں نے بالوضاحت بیان کر دیا تھا۔ وہ مطمئن ہے البتہ مقامی اثرات اس پر غالب ہیں۔ اس کے لیے میرے پاس چارہ نہیں۔ لیکن میں اسے ( ) کی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور کر لوں گا۔

جیسی کہ افواہیں گرم ہیں میں ریڈیو میں پی اے کی ملازمت نہیں کروں گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ کرشن صبح دس بجے جاتا ہے اور پھر رات کے گیارہ گیارہ بجے واپس آتا ہے۔ ( ) قسم کی زندگی سے میں آشتی کا ہاتھ نہیں بڑھا سکتا۔

اپندر ناتھ سے میں نے "چٹان" کا تذکرہ کیا تھا۔ اس نے مجھے ظہیر وغیرہ ( ) خطوط دکھائے معاملہ ایک نوعیت سے طے ہو چکا تھا۔ لیکن میں نے اسے مجبور کیا ہے کہ اسے فسخ ( ) اور شرائط وہی ہیں جو "گرہن" کے سلسلے میں طے ہوئی تھیں۔ اولاً تو وہ پیسے پیشگی ( ) اور پھر پہلے کانٹریکٹ میں صرف ایک ترمیم ہے اور وہ یہ کہ ایک ایڈیشن کے لیے کم از کم ( ) رکھی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کوئی بڑی شرط نہیں۔ آخر تم ایک ہزار کتاب کو تین برس کے طویل ( ) فروخت کر ہی سکتے ہو۔ ظہیر نے اس کی مذکورہ تمام شرائط مان لی ہیں۔ چوں کہ ظہیر سے وہ قطعی بدمعاملگی نہیں چاہتا اس لیے وہ اسے اپنے اوسط درجے کے افسانے دے کر راضی کر لے گا۔

"گرہن" کا سرورق یہاں احباب نے توقع سے زیادہ پسند کیا ہے۔ سوکھتا ذرا دیر میں ہے۔ اس بات کا

خیال رکھنا اور جلد سرخ کی بجائے بے شک دوسری یعنی "مہاگنی" رنگ کی بنوا دینا۔ وہ بھی کالے رنگ کے ساتھ زیب دیتی ہے۔ نیز کتاب کا اوپر کا حصہ ضرور رنگوانا۔

"نئے دیوتا" کی وجہ سے یہاں میری کافی "عزت" ہے۔ مجھے یہاں سب لوگوں سے راشد زیادہ پسند آیا اور کرشن بھی۔ کرشن مجھے ایک نیا آدمی دکھائی دیتا ہے۔ بہت سے آدمی بنیادی طور پر اچھے ہوتے ہیں لیکن اپنی ہی آنکھوں کے قصور سے عجب رنگ میں دکھائی دیتے ہیں۔ میں اسے بھی پسند کرتا ہوں۔

میں چند دن کے بعد واپس آرہا ہوں اور "چٹان" وغیرہ ساتھ لیتا آؤں گا۔ ( ) ہو تو اس خط کا جواب اپندر ناتھ کی معرفت دے دینا۔

تمہارا

راجندر سنگھ بیدی

پ۔ ش۔ خط مجھے اپندر ناتھ کے گھر کے پتے پر بھیجنا۔ پتا میں نے شروع خط میں لکھ دیا ہے۔

(خط کی حالت نا گفتہ بہ ہے۔ آب زدہ معلوم ہوتا ہے اور ایک طرف سے گل گیا ہے۔ اس لیے بعض لفظ پڑھے نہ جا سکے)

17 Adelphi chambers
Clare Rood
Bombay. 8

مکرمی چوہدری صاحب

میں نے ڈراموں کی کاپیاں بذریعہ رجسٹرڈ پارسل بھیج دی تھیں۔ امید ہے آپ نے وصول کر لی ہوں گی۔ براہِ کرم رسید سے مطلع فرمائیے۔

ایک خط میں نے خورشید انور کے ہاتھ آپ کو بھیجا تھا۔ کیا مل گیا ہے؟ اگر مل گیا ہے تو اُن باتوں کا فوراً جواب لکھیے جو میں نے اس میں دریافت کی تھیں۔ وہ ڈرامے جو آپ نے شائع نہیں کیے یعنی کتاب میں شامل نہیں کیے مجھے بواپسی ڈاک روانہ فرما دیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔

دیکھیے کتاب کے آغاز میں میں نے ریڈیو آرٹسٹوں کے نام اپنی کتاب معنون کی تھی۔ یہ انتساب مجھے کاپیوں میں نظر نہیں آیا۔ یہ ضرور شامل ہونا چاہیے اور پروف بھی میں ضرور دیکھوں گا۔

غالب آپ کب تک چاہتے ہیں۔

عصمت سے میں بات چیت کر رہا ہوں۔ ہفتے کو اس نے ہم لوگوں کو اپنے گھر بلایا ہے۔ وہاں مفصل گفتگو کروں گا۔ آپ اگر آنا چاہیں تو آسکتے ہیں۔ دس بارہ صفحے کے اشتہار جمع ہو جائیں گے۔ مطمئن رہیں۔

"تین عورتوں" کی کتابت ابھی نہ کرائیے گا۔ میں ان ڈراموں کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے آج کل کچھ فرصت ہے اس لیے بہتر ہو گا کہ آپ بواپسی ڈاک ان کو بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ روانہ کر دیں تاکہ میں انھیں دیکھ کر اپنا اطمینان کر لوں۔ یہ بھی بہت ضروری ہے۔

"مجھے بھی کچھ کہنا ہے" والے مضمون کی اصل کاپی عباس کو دے دیجیے۔ یہ میرے مضامین کے مجموعے میں شائع ہو رہا ہے۔

سالنامے کے لیے میرا افسانہ آپ کو مل جائے گا۔ عنوان "ٹیلی فون" ہوگا۔ آپ اعلان کر سکتے ہیں۔

یہ دو کام جو میں نے آپ کے سپرد کیے ہیں براہِ کرم جلدی کر دیجیے گا۔ مجھے "تین عورتوں" کے ڈراموں اور "منٹوں کے ڈرامے" کے بقایا ڈراموں کا سخت انتظار رہے گا۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

C/O Bella vista
Hyderabad Deccan

۱۳ جنوری ۱۹۴۳ء

مکرمی جناب ندیم احمد صاحب قاسمی

میں نے آپ کو "ادبِ لطیف" کے لیے ایک افسانہ "زون" کے عنوان سے بھیجا تھا۔ اس کے متعلق اب تک کوئی گرامی نامہ ملا اور نہ مسودہ واپس۔ شاید غلطی میری تھی۔ اب میں ٹکٹ ارسال کر رہا ہوں۔ اگر افسانہ ناپسند یا ناموزوں ہو تو واپس ارسال فرمائیں۔

میں اب سے بارہ چودہ سال قبل اردو میں مضمون نگاری کرتا تھا۔ اب تو اس کی بہت کم مہلت ملتی ہے۔ آپ لوگوں کی دیکھا دیکھی۔ درسِ فلسفہ میں داد و عاشقی ورزید کے باوجود... اب کچھ وقت نکال کے لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ کی رہنمائی میں "ادبِ لطیف" کو پروان چڑھتے دیکھ کے مجھے خوشی ہوتی ہے۔ جوں جوں "ساقی" کا معیار گر رہا ہے "ادبِ لطیف" کا بلند ہوتا جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اسے بلند تر بنائیں گے اور جس طرح "اردو" اور "ہندوستانی" خشک ادب کے بہترین رسالے ہیں اسی طرح آپ کا پرچہ لطیف ادب کا بہترین نمونہ بنے گا۔ بہتری ایک ایسی صفت ہے جو ساکن نہیں رہتی اور جس میں ہمیشہ ترقی ہوتی رہتی ہے۔

"زون" کے متعلق میں اگر کچھ کہوں تو وہ اعترافِ گناہ بدتر از گناہ ہوگا۔ لیکن اگر آپ اجازت دیں تو اس کے مرکزی خیال کے متعلق میں یہ عرض کروں کہ میں انسان اور فطرت (ارتقاء بالضد کی مادیت کی تسلیم کردہ، ذہنِ انسانی سے پرانی، اور آزاد، اور مقصود بالذاتِ فطرت) دونوں کی حد تک اس کا قائل ہوں کہ ان میں ایک مادۂ تخریب موجود ہے۔ مزدکیت اس کی بہت زیادہ قائل تھی۔ اس مادۂ تخریب کا کام زندگی کی تمام انسانی قدروں کو مسخ اور تاراج کرنا ہے اور اشتراکی نظریۂ انسانیت کا سب سے بڑا فرض پہلے انسان اور پھر فطرت کے مادۂ تخریب سے جنگ ہے.... اس طرح اسٹالن گراڈ کا تحفظ اور علم طب کی ترقی، دونوں جدید

انسان کی اس مادۂ تخریب سے جنگ کے آئینہ دار ہیں۔ "زون" میں یہی مادۂ تخریب فطرت کی حد تک انسانی جانوں کو، اور انسانی سماج کے خود غرض تصوّرات کی حد تک صوری اور حیاتی نسوانی حُسن کو تباہ کرتے دکھایا گیا ہے۔

امید ہے کہ آپ سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہے گا اور آپ مع الخیر ہوں گے۔

فقط

عزیز احمد

بارود خانہ۔ لکھنؤ

۶ جولائی ۴۴ء

محبی نذیر احمد صاحب۔ تسلیم

میں ادھر برابر لکھنؤ سے باہر رہا اور اس طرح پھرتا رہا کہ میری ڈاک مجھے وقت پر کہیں بھی نہ مل سکی۔ آج صبح واپسی پر آپ کا خط ملا۔ مجھے ضرور افسوس ہے کہ میں نے ادھر آپ کو یا قاسمی صاحب کو کوئی خط نہیں لکھا۔ بالکل ناراض نہیں ہوں اس کا خیال دل میں نہ لائیے۔

مقدمے کے تفصیلی حالات آپ حضرات نے کبھی نہ لکھے۔ خیر رسالے میں لکھنا تو ٹھیک نہیں لیکن کبھی خط میں تو لکھ ہی سکتے تھے۔ اب وہ کس منزل میں ہے۔ بہت افسوس ہے کہ تجارتی رقابت اور دوسرے اختلافات ادبی زندگی پر اس طرح اثر انداز ہو رہے ہیں۔ گواہی کے متعلق تو نہیں لیکن اشارتاً چند جملے احمد ندیم صاحب نے بھی لکھے تھے۔ بھائی میں نے آج تک کبھی عدالت میں قدم نہیں رکھے ہیں اور نہ ارادہ ہے۔ رہ گئی واقعی ہمدردی وہ سو فی صد آپ کے ساتھ ہے جس افسانے کا معاملہ ہے وہ مجھے ذاتی طور پر زیادہ پسند نہیں، یہی حال تقریباً ڈاکٹر علیم صاحب کا ہے۔ مجھے بہت کم امید ہے کہ وہ اس سلسلے میں کام آئیں گے اگر وہ یہاں ہوتے تو میں دریافت کر لیتا۔ اگر لکھیے تو میں آپ کی طرف سے استزاج کروں۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس معاملے میں تھوڑی بہت احتیاط ہم لوگوں کو اس لیے برتنا چاہیے کہ اچھی چیزیں بھی عام پروپگنڈے کی زد میں آگئی ہیں۔ معترضین کو نہ فحاشی کے معنی معلوم ہیں اور نہ عریانی کے چوں کہ ایک ایسی چیز کا وجود سستے قسم کے ادب میں پایا جاتا ہے اس لیے وہ اس سے ملتی جلتی تمام چیزوں کو سمجھ لیتے ہیں۔ اس لیے اس وقت تک بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے جب تک لوگ کچھ پڑھ لکھ نہ لیں۔

کرشن چندر سے میں نے "نئے زاویے" کے لیے مضمون کا وعدہ کیا تھا۔ جب میں لکھ چکا تو کرشن نے کسی اور مضمون کی فرمائش کر دی۔ فرمائشوں پر ہر وقت لکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ میں نے بالکل ٹال دیا اور اس مضمون کو مراد آباد کانفرنس میں پڑھا، وہ ادیب میں چھپا پھر ایشیاء وغیرہ میں نقل ہو گیا۔ "اردو ادب

میں ترقی پسندی کی روایت" اس کا عنوان تھا اور وہ "نئے زاویے" کے لیے بہت موزوں تھا۔ میرا خیال ہے کہ کرشن چندر نے ترقی پسند ادب پر کسی اور سے لکھنے کا وعدہ لے لیا اس لیے وہ مجھ سے کوئی اور مضمون چاہتے تھے۔ میرے وعدے اور اس کے ایفاء کی یہ تاریخ ہے جس کو ڈیڑھ سال سے کم نہ ہوا ہوگا۔ اب اس کی تجدید کی صورت یہ ہے کہ میں نے بالکل طے کر لیا ہے کہ بغیر معاوضے کے ایسے مضامین نہ لکھوں گا جس سے ناشر کوئی نفع اٹھا سکتا ہے۔ آپ اسے اچھا سمجھیں یا برا یہ میرا قطعی فیصلہ ہے اس لیے عرض ہے کہ "نئے زاویے" کے لیے جو مضمون لکھوں گا اس کے تقریباً پانچ روپے فی صفحہ لوں گا۔ ایسی حالت میں آپ سے دریافت کر لینا ضروری ہے کہ آپ مضمون لکھوائیں گے یا نہیں اور کس موضوع پر لکھوائیں گے۔ شائع شدہ مضامین میں سے اگر آپ کوئی مضمون چاہیں گے تو میں بھیج دوں گا لیکن یہ کچھ اچھا نہ ہوگا کہ ایسے مجموعے میں مطبوعہ مضمون شامل کیا جائے۔

افسانہ نمبر کے لیے ایک مختصر سا مضمون بہت جلد بھیجوں گا۔ اس کا کوئی معاوضہ نہ ہوگا کیوں کہ اس کے لیے پہلے سے وعدہ کر چکا ہوں۔

آپ سے کبھی شرفِ نیاز نہ حاصل ہو سکا ورنہ آپ میری اُفتادِ طبع سے واقف ہو جاتے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اس تجارت کے زمانے میں بھی اپنی قدر و قیمت کے بڑھانے کے ذرائع اختیار کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ میں نے آپ کو لکھ تو دیا تھا کہ ایک مجموعہ شائع کرانا چاہتا ہوں لیکن کوئی ہمت افزا جواب نہ پا کر خاموش ہو رہا۔ تین چار مہینے ہوئے حیدرآباد کے ناشر ادارۂ اشاعت اردو نے مضامین کے ایک مجموعے کے لیے بہت اصرار کیا اور میں نے انھیں اپنے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ تین سال کے لیے دے دیا وہ جولائی کے آخر تک بازار میں آ جائے گا۔ حیدرآباد ہی کے ایک دوسرے ناشر نے ایک اور مجموعے کے لیے لکھا ہے جو میں مرتب کر رہا ہوں لیکن میں نے ابھی ان سے کوئی وعدہ نہیں کیا ہے۔ افسانوں کا ایک مجموعہ بہت دنوں سے الہ آباد میں پڑا ہوا ہے وہاں ایک دوست نے پبلشنگ ہاؤس قائم کیا ہے معلوم نہیں وہ کب تک شائع کریں گے۔ اگر آپ واقعی میری کوئی کتاب شائع کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی عذر نہیں صرف آپ کا ارادہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ یہی خط قاسمی صاحب کو بھی پڑھا دیجیے گا۔

چودھری برکت علی صاحب تسلیم ساحر لدھیانوی صاحب آپ کے یہاں سے ایک مجموعہ ادب اور جنگ شائع کرنا چاہتے ہے وہ کب تک نکل رہا ہے۔ آئندہ کون سی کتابیں شائع کر رہے ہیں۔ مفصل لکھیے۔

مخلص

سید احتشام حسین

دہلی
۲۹، اکتوبر

برادرِ مکرّم۔ اسلام علیکم

آپ کا خط تین چار دن ہوئے مل گیا تھا۔ آپ کو میری طرف سے غلط فہمی ہوئی۔ اس سے پہلے والے خط میں بھی میں نے لکھا تھا کہ ریویو کی نقل میں اشک صاحب کو دے کر علی گڑھ چلا گیا تھا۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے جلد از جلد آپ کے پاس بھیج دیں گے۔ لیکن وہ کسی وجہ سے نہیں بھیج سکے۔ اس کا علم مجھے کوئی مہینہ بھر کے بعد ہوا اور میں نے آپ کو خط کے ذریعے اس بات کی اطلاع بھی دی۔ لیکن چونکہ افسانہ نمبر میں اس کا شامل ہونا ممکن نہیں تھا، اس لیے شاید آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بہر حال پہلے ریویو کی ایک نقل آپ کو بھیج رہا ہوں۔ دوسرے ریویو کی نقل جلد حاصل کر کے بھیجوں گا۔ اس دفعہ سالنامے کے لیے میں مضمون ضرور لکھوں گا۔ اس (کا) عنوان ابھی سے بتائے دیتا ہوں۔ "اردو شاعری میں خدا کا تصور" آپ شوق سے اعلان کر سکتے ہیں۔

"رفیق تنہائی" کا ایک نسخہ مجھے بھیج دیجیے۔ اس دوران میں اگر کوئی اور نئی کتاب نکلی ہو اور آپ اس پر ریویو کروانا چاہتے ہوں تو وہ بھی بھیج دیجیے۔ یہاں اور کوئی خاص بات نہیں۔ امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

پُرسانِ حال کی خدمت میں سلام علیک

نیازمند
وقار عظیم

مکرمی چودھری صاحب۔ تسلیم

نامۂ عنایت ملا۔ مضراب کا اشتہار بھیجتا ہوں۔ کل ریڈیو کے مشاعرے میں شرکت کے لیے دہلی جا رہا ہوں۔ تیرہ کو واپس ہوں گا۔ اس وقت اسٹامپ آپ کو بھیج دوں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ اس کی رقم آپ جلد سے جلد روانہ فرمادیں گے۔ ہاں اگر مناسب خیال فرمائیں تو اشتہار ادبِ لطیف کے سالنامے میں بھی دے دیجیئے۔ دوسرا مجموعہ میں اپریل تک آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا، آپ اسے یقینی پسند فرمائیں گے۔ اس کے دیباچے کے لیے میں فراق اور اختر رائے پوری کو لکھ رہا ہوں، بہر کیف اسے مکمل صورت میں آپ کے پاس بھیجوں گا۔ مطمئن رہیں۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

آپ کا مخلص
جان نثار اختر

مکرمی و محبی۔ تسلیم

ادبِ لطیف کے لیے ایک مختصر سی نظم ارسال کر رہا ہوں۔ آپ کے سالنامے کا ابھی تک انتظار ہے۔
اسٹامپ کل اول وقت بذریعہ وی پی ارسال کر رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ وصول فرمالیں گے۔ میں پانچ کو چند دن کے لیے علی گڑھ جا رہا ہوں۔ ساحر صاحب سے سلام کہیے اور کہیے کہ آج اپنے مجموعے کے حقوق کا اسٹامپ تحریر کرتے وقت ان کی نظم "فن کار" نے بہت ستایا۔

آپ کا مخلص
جان نثار اختر
فوٹو انشاءاللہ جلد بھیجوں گا۔

آل انڈیا ریڈیو
پشاور
۱۱ جنوری ۴۳ء

مکرمی۔ یادآوری کا شکریہ۔ اس سے پیشتر میں اپنی ایک نظم "تیاگ" آپ کو بھیج چکا ہوں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی وجہ سے آپ کو مل نہ سکی ورنہ اب تک ضرور شائع ہو جاتی۔ وہی نظم اب سالنامے کے لیے دوبارہ ارسال کر رہا ہوں۔ نظم غیر مطبوعہ ہے اور ان نظموں میں سے ایک ہے جنھیں مکمل کر کے کئی روز تک میں نے ایک نشہ سا محسوس کیا تھا۔ آپ نظم کی طوالت سے خائف نہ ہوں۔ ایک دو بار پڑھنے کے بعد اگر آپ نے اس کے لیے ادبِ لطیف کے دو صفحے مخصوص نہ کیے تو سمجھوں گا آپ نے کاغذ کی گرانی کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ آئندہ آپ ادبِ لطیف اس پتے پر ارسال کیا کریں۔

لیکن خط و کتابت پشاور ہی کے پتے پر جاری رکھیے۔
والسلام

مخلص
مسعود پرویز

مکرمی جناب چودھری صاحب۔ تسلیم
میں نے اپنے پچھلے خط میں اپنی کہانی "تخلیق" کے بارے میں لکھا تھا۔ اس خط کے ساتھ کرشن چندر کا وہ خط بھی آپ کو بھیجا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ کہانی آپ اس کے پاس نہیں چھوڑ گئے بلکہ

یہ کہہ کر اپنے ساتھ لاہور لے گئے تھے کہ اسے ہم سالنامے میں شائع کریں گے۔ برائے مہربانی اس کہانی کو آپ اس خط کے دیکھتے ہی مجھے بھیج دیجیے۔ کہانی کے سلسلے میں میرا یہ تیسرا خط ہے آپ کے نام۔ اُمید ہے کہ اب مجھے مزید یاددہانی کی ضرورت نہ پڑے گی۔

چودھری برکت علی صاحب سے سلام کہیے۔

مخلص

شاہد لطیف

(شاہد لطیف نے تاریخ درج نہیں کی لیکن خط پر چودھری نذیر احمد نے اپنے ہاتھ سے یکم دسمبر ۱۹۴۴ء تحریر کیا ہے۔)

کالی داس گپتا رضا کا مرتّب کردہ

دیوانِ غالب کامل

غالب شناسی کی ایک نئی مشعل
کلامِ غالب مستند تاریخی ترتیب کے ساتھ

قیمت: ۱۵۰ روپے
انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

مضمون صاف، خوش خط اور صفحے کے ایک طرف لکھیں۔

کلثوم طارق برنی

"نواب آزاد کی روداد نویسی"

نواب سید محمد آزاد نے ڈکشنری اور نامہ و پیام کے سلسلوں کے علاوہ اودھ پنچ کے لیے فرضی اجلاسوں کی روئداد بھی لکھی۔ "خیالات آزاد" میں دو رودادیں شامل ہیں۔ پہلی روداد فروری ۱۸۷۸ء اور دوسری روداد یکم اپریل ۱۹۰۳ء کی تحریر کردہ ہے۔ آزاد نے "اودھ پنچ" کے لیے کتنی رودادیں تحریر کیں۔ اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔کیوں کہ اودھ پنچ کی جلدیں پاکستان کے لیے اب خواب و خیال بن گئی ہیں۔

روداد نویسی سے مراد کسی تقریب، جلسے، اجلاس، مشاعرے یا دیگر تقریبات کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرنا ہے۔ روداد نویسی میں مصنف غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے شامل ہوتا ہے۔ روداد میں جو دیکھا جاتا ہے اسے اسی اختصار، ترتیب اور حسن کے ساتھ پیش کر دیا جاتا ہے۔ روداد اس طرح سے بیان کی جاتی ہے کہ قاری کے ذہن میں تقریب کا ایک نقشہ سا کھنچ جائے۔ روداد نویسی کے لیے مشاہدہ گہرا، نظر وسیع اور اندازِ بیان اچھوتا ہونا چاہیے۔ روداد کے بیان میں واقعیت، انشاء کا حسن، سادگی اور پُر وقار انداز پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔

نواب آزاد جب پہلے فرضی اجلاس کی روداد تحریر کرتے ہیں تو اُسے "خمارستان" کے تہذیب یافتہ مدّکیوں کی تجارت کے جلسے کا سالانہ ڈنر" کا نام دیتے ہیں۔ اجلاس میں شریک افراد کے نام ابتداء میں بمعہ عہدہ دیے ہیں۔ اس میں ارکانِ مجلس مسٹر پینک الدولہ، چسکی الملک، مرزا خمار بیگ، میر مہر و خان، سید بانپو جنگ، دھواندھار خان ہیں۔ ہر رکن کا نام بھی اپنے اندر خمار کی کیفیت رکھتا ہے۔ یہ روداد ایک چلتی پھرتی تصویر ہے۔ جسے ہم دیکھ رہے ہیں، پڑھ رہے ہیں اور اس سے لطف بھی لے رہے ہیں۔

دوسری روداد جنجال کونسل کے اجلاس کی ہے جس میں سرکاری ممبروں سے سوالات کیے گئے ہیں اور سرکاری ممبران ان کا جواب ترتیب وار دیتے ہیں۔

ان دونوں اجلاسوں کی روداد دراصل نواب آزاد کی انشاپردازی کی بہترین مثالیں ہیں۔ انگریزی عہد میں میونسپل کمیٹیوں اور کونسلوں کا نیا نیا جال ملک میں پھیلایا گیا تھا۔ ان کمیٹیوں اور کونسلوں کے جلسوں میں سرکاری نامزد اور منتخب ارکان کی بحث اور سوال و جواب کا نقشہ دلچسپ سماں پیش کرتا ہوگا۔ آزاد نے اس کی مرقع کشی کی ہے۔ ان اجلاسوں کی روداد میں نواب آزاد کا اسلوب نگارش اپنے عروج پر ہے۔ عبارت مقفیٰ نہیں۔ بلکہ اس میں سادگی اور روانی ہے۔ روداد کے بیان میں سادگی کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ لفظوں کے موتی تحریر میں پروئے ہیں۔ اپنی خیال آرائی کے سبب ایسی ایسی گل کاریاں تحریر میں کی ہیں کہ پڑھنے والے ان کی تحریر کے حسن میں کھو جاتے ہیں۔

> "یہ اسی متبرک چیز کی برکت ہے کہ ہمارے ملک کے لوگوں نے آج تک بجز
> اس کی یاقوتی رنگت کے خون کی رنگت تک کبھی خواب میں نہیں دیکھی اور یہ اُسی

کی کرامت ہے کہ صدہا سال سے ہمارے کان بجز سامعہ نواز آواز بانپو کے توپ و
بندوق کی وحشت انگیز اور ہیبت ناک اور عافیت سوز آواز سے آشنا نہیں۔ (چیرس)
یہ اُسی پری کا جلوہ ہے جس کا تصور ۱۲ بجے دن تک ہم لوگوں کو آنکھ نہیں کھولنے دیتا
اور یہ اسی حور کا عشوہ ہے جس نے ہم کو ساری دنیا کی شیطانی اور نفسانی ہوسوں اور
لذتوں اور خواہشوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔"(۱)

تحریر میں سادگی کے ساتھ بھرپور طنز شامل کر دیا ہے۔ مگر مزاح کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی ہے اور طنز میں تیزی باقی نہیں رہی۔ نواب آزاد کے طنز سے روح میں گھٹن پیدا نہیں ہوتی۔ روداد میں وہ جن حضرات کی تقاریر کا بیان کر رہے ہیں دراصل وہ اُن کرداروں کے ذریعے اپنے خیالات خاص کا اظہار فرما رہے ہیں۔

"اس لیے ضرور ہے کہ میں اُن کی قدرت انتظام ملکی اور اُس کے عمدہ نتیجوں
کی طرف رجوع کروں، اور مشتے نمونہ از خروارے آپ لوگوں کو سناؤں۔ جو صفائی اور
رونق کہ سر رشتہ آب کاری کی اُن کے زمان حکومت میں ہوئی ہے۔ ایسی کبھی آج
تک دیکھی نہیں گئی تھی اور صرف شراب اور افیون کی تجارت کو ترقی دینے سے اس
قلیل عرصے میں تہذیب اور علم ایسا شائع ہوا ہے کہ ہر کوچہ و بازار میں شراب خانے
اور مدک خانے کثرت سے نظر آتے ہیں اور اُن کے دیکھنے سے نیک نیت آدمیوں
کی آنکھوں کو بڑا آرام ملتا ہے۔ ٹیکس کی تلخ گوئی کو مصلحت ملکی اور خزانہ خالی کے
خیال سے حکمتِ عملی کی مصری میں ملا کر اس چالاکی سے انھوں نے ہم لوگوں کو
کھلا دیا ہے جس طرح لڑکوں کو دوائے تلخ شہد ملا کر۔"(۲)

نواب آزاد طنز میں مزاح کی چاشنی دے کر اپنے دل کی بات بھی کر جاتے ہیں اور حکومتِ وقت پر طنز بھی نواب سید محمد آزاد کی روداد نویسی بھی اُن کی تحریروں کی خوش طبعی اور شادابی کی رزندہ تصویر ہے۔ وہ اپنے خیال کو الفاظ کا جامہ اس طرح پہناتے ہیں کہ وہ خیال زندہ ہو کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

مزاح کی کیفیت کے ساتھ مل کر اُن کے طنز کی کاٹ اگرچہ ہلکی پڑ جاتی ہے مگر اُن کی بات اپنا اثر چھوڑ جاتی ہے۔

"جس سیمونی وبا کی طرف آنریبل ممبر نے توجہ دلائی ہے اُس کی کوئی خبر
گورنمنٹ کو نہیں ہے بہت تحقیق کرنے کے بعد حکام سے معلوم ہوا کہ ضلع
بیر بھوم کی ایک بستی میں جو پہاڑ تیسی کے قریب ہے ایک بڑا جنگلی بھالو بھاگ
کر نکل آیا تھا اور اُس نے اس اطراف کے دو چار شخصوں کو زخمی کیا تھا صاحب
مجسٹریٹ نے اُسے گولی سے شکار کیا اور زخمیوں کو اسپتال میں بھجوا دیا ہے اس جانور
کے مجروحین کے زخموں میں کوئی خاص سمیت صاحب سول سرجن نہیں پاتے۔
تاہم آنریبل ممبر کے شکوک رفع کرنے کے خیال سے گورنمنٹ نے حکم دیا ہے کہ اس
بھالو کے دانت کیمیکل اگزامز کے یہاں امتحان کے لیے بھیج دیے جائیں۔ نتیجہ

امتحان آئندہ کونسل میں ممبران عالی شان کی واقفیت کے لیے پیش کیا جائے گا۔"(۳)

تحریر میں خاص رپورٹ کی سنجیدگی کے طنز کی اعلیٰ روح بھی پائی جاتی ہے۔ نواب سید محمد آزاد کی انھی خصوصیات کی بناء پر انھیں ہورسیس اور چاسر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اُن کی تحریر میں ہنر، پھکڑپن، تمسخر اور پھبتی۔؟... کے بجائے سنجیدہ مزاح اور طنز کی صورتیں موجود ہیں۔

حواشی:۔

۱۔ نواب سید محمد آزاد خیالات آزاد ص ۲۰۸

۲۔ نواب سید محمد آزاد خیالات آزاد ص ۲۱۰ تا ۲۱۱

۳۔ نواب سید محمد آزاد خیالات آزاد ص ۲۸۰ ۔

ڈاکٹر انور سدید کی نئی کتاب

اُردو ادب کی تحریکیں

امیر خسرو سے لے کر عہد حاضر تک اُردو ادب کی اہم تحریک کا تجزیہ اس کتاب پر مصنف کو پنجاب یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی۔ یہ کتاب سی ایس ایس کے امتحان اور ایم اے اُردو کے چوتھے پرچے کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔

چند مندرجات

ریختہ کی دو تحریکیں — ایہام کی تحریک — اصلاحِ زبان کی تحریک

علیگڑھ تحریک — فورٹ ولیم کالج — انجمن پنجاب کی تحریک

رومانوی تحریک — ترقی پسند تحریک — حلقۂ اربابِ ذوق

اقبال کی تحریک — اسلامی ادب کی تحریک — ارضی ثقافتی تحریک

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

گلہائے رنگ رنگ
بنگلہ کہانی

عبدالمبین / ترجمہ احمد سعدی

ٹیکس کا مسئلہ

نوٹس بارش کی طرح برستا ہے، روزانہ آتا ہے، ماہ بہ ماہ آتا رہتا ہے، کبھی ٹیکس میں اضافہ تو کبھی مالگزاری میں اضافہ، اضافہ اور اضافہ۔ جہاد علی کے لیے یہ سب کچھ سوتیلی ماں کے بُرے سلوک کی طرح برداشت کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

آج دوپہر کے وقت جو نوٹس اُسے دوکان پر ملا تھا، جہاد علی کو مصروفیت کی بناء پر شام تک اُسے پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ دوسرے تمام نوٹس دفتر کے چپراسی لے کر آتے تھے۔ وہ سب ڈرا دھمکا کر، غصہ دکھا کر دو چار روپیہ بخشش ادا کرتے اور سلام کر کے چلے جاتے۔ لیکن جو آدمی نوٹس لے کر آیا تھا، وہ خاموشی سے نوٹس دے کر چلا گیا تھا۔ شاید کوئی نیا آدمی تھا جو ابھی نذرانہ وصول کرنے کے آداب سے ناواقف تھا۔

آسمان کا رنگ اچھا نہیں تھا، اسی لیے جہاد علی سویرے سویرے ہی دکان بند کر رہا تھا۔ گزشتہ کل پانی میں بھیگ کر گھر لوٹنا پڑا تھا۔ صرف بھیگنا ہی نہیں پڑا تھا۔ راستے میں روشنی نہیں تھی، اندھیرے میں پانی اور کیچڑ روندتا ہوا جب گھر پہنچا تو جمیلہ خاتون نے اُسے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی تھی۔ جہاد علی گھٹنوں تک غلاظت میں لتھڑ گیا تھا۔ سیوریج لائن کے اُبل جانے کی وجہ سے پانی کے ساتھ غلاظت بھی بہہ کر راستے پر آگیا تھا۔ اس نے آنگن میں کھڑے ہو کر غسل کیا تھا اور تب گھر میں داخل ہوا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اُسے بلدیہ کے ٹیکس میں اضافہ کا نوٹس ملا، وہ بھی کوئی معمولی اضافہ نہیں، چار گناہ اضافہ کا نوٹس تھا۔

دکان کی کھڑکیاں بند کر کے باہر آتے ہوئے جہاد علی نے نوٹس کو کھینچ کر باہر نکالا اور اس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ نوٹس بجلی کے دفتر سے آیا تھا۔ اُسے اب کمرشیل ریٹ سے بجلی کا بل ادا کرنا ہوگا، یہ ریٹ بھی سابقہ ریٹ سے چار گناہ زیادہ تھا۔

اُس کی بال تراشنے کی دکان تھی، دن بھر وہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ دو روپے کے حساب سے دس بارہ آدمیوں کے بال تراشتا اور ڈیڑھ روپے کے ریٹ سے آٹھ دس آدمیوں کی ڈاڑھی شیو کرتا۔ اسی کاروبار کے لیے اب اُسے کمرشیل ریٹ سے بجلی کا بل ادا کرنے کا حکم ہوا تھا۔ نوٹس پڑھنے کے بعد جہاد علی نے دل ہی دل میں ہیئر کٹنگ اور شیو کا ریٹ بڑھا دینے کا منصوبہ بنایا۔ ہیئر کٹنگ پانچ روپے اور شیو تین روپے اس نے سوچا، اس گرانی کے دور میں آدمی جس طرح مہنگائی کا عادی ہو چکا ہے۔ اس اضافہ کا ان پر کوئی خاص اثر نہیں پڑے گا۔

سوچتے سوچتے جہاد علی راستے پر آگیا۔ آج راستے میں بتی جل رہی تھی۔ لیکن بادلوں کا بوجھ اب آسمان کے لیے ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا گھر پہنچا، گھر آنے پر اُسے معلوم ہوا کہ گھر کی بجلی فیل ہو گئی تھی۔ وہ دن بھر کام کر کے بہت تھک گیا تھا۔ اس نے برآمدے پر ایک موڑھا ڈال دیا اور بیٹھ کر بجلی بتی کا انتظار کرنے لگا۔

"پہلے کراسن تیل سے چراغ جلاتی تھی، اپنی مرضی سے جلاتی تھی اور بجھاتی تھی۔ ٹیوب ویل کا پانی تھا۔ اپنی مرضی سے پانی کا استعمال کرتی تھی، کسی کی محتاجی نہیں تھی، کسی کی خوشامد نہیں کرنی پڑتی تھی اور آج روشنی کے لیے، پانی کے لیے دوسروں سے مہربانی کی بھیک مانگنی پڑتی ہے۔ بجلی آئے نہ آئے، پانی ملے نہ ملے، دو چار ماہ بعد بل ٹھیک ہی آئے گا۔ اس میں پانچ سات دن کا وقت ہوگا، مقررہ وقت پر ادائیگی نہ کرنے پر جرمانہ بھرنا ہوگا، سرچارج دینا ہوگا، دو چار بل کی ادائیگی نہ ہو تو لائن کاٹ دینے کی دھمکی دیں گے، جیسے ان کی زمینداری ہو۔ میں کہتی ہوں یہ جو سپلائی کا پانی نہیں آتا، ہر ماہ بل نہیں آتا تو اس کے لیے ہم سرچارج کیوں بھریں گے؟" جمیلہ خاتون شوہر کو مخاطب کر کے لال پیلی ہو کر ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی۔ "رات کے آٹھ بج رہے ہیں، کچھ خیال بھی ہے؟ پہلے تو شام کو چراغ جلانے میں ذرا سی دیر ہو جاتی، گھر آنے پر بالٹی میں پانی نہ ملتا تو بیوی کو پیٹنے چلے آتے تھے، اب چپ کیوں بیٹھے ہو؟"

"تو کیا میں وہاں جا کر ان لوگوں سے مار پیٹ کروں؟" جہاد علی نے جواب دیا۔

"میں جاتی ہوں، وہ تم سے نہ ہوگا، موم بتی ہو یا کراسن تیل ہو، کچھ تو لے کر آؤ تاکہ روشنی جلاؤں۔ دوپہر میں دھاگے کی طرح پتلی دھار میں تھوڑی دیر کے لیے نلکے میں پانی آیا تھا، زیادہ سے زیادہ دو بالٹی کے برابر ہوگا۔ اُسے میں نے پینے کے لیے رکھ چھوڑا ہے، مزید دو بالٹی ہونے سے کھانا پکانے کے لیے کافی ہوتا۔ پانی بند کر کے جو لوگ پانی کا کاروبار کرتے ہیں، اس کا انصاف اللہ ہی کرے گا۔" جمیلہ نے کہا۔

جہاد علی نے سوالیہ نگاہوں سے بیوی کی طرف دیکھا۔

جمیلہ نے مزید کہا۔ "دن رات میں کسی دن بھی دو چار بالٹی سے زیادہ پانی نہیں آتا، پھر بھی پانی فراہم کرنے والے ادارہ کا نوٹس آیا ہے، اب تمھیں کمرشیل ریٹ سے پانی کا بل ادا کرنا ہوگا، لیوں کہ تم اپنے گھر میں ختنہ کا کاروبار کرتے ہو۔"

جمیلہ کی باتیں سن کر جہاد علی قہقہہ لگا کر یوں ہنسا جیسے وہ ہنسنے کے بہانے رو رو کر فریاد کر رہا ہو۔

جمیلہ نے کہا۔ "کل دفتر جا کر تم صاحبوں کو سمجھا کر کہہ آؤ کہ ہمارے گھر میں کوئی ختنے کی فیکٹری نہیں ہے جو کمرشیل ریٹ سے پانی کا بل ادا کرنا ہوگا۔ سال میں صرف دو تین ماہ ختنے کا موسم آتا ہے، اس میں چند لڑکوں کا ختنہ ہی تو ہوتا ہے۔ سمجھا کر کہنے سے یہ بات ان لوگوں کی سمجھ میں ضرور آئے گی۔ ملک میں جو قانون رائج ہے وہ عام انسانوں کی آسانی کے لیے ہے، پریشانی کے لیے نہیں ہے۔"

جہاد علی نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ہاں، آسانی کے لیے ہی ہے، لیکن سبھوں کی آسانی کے لیے نہیں، سرکاری دفتروں کے چند قرابی کبابی افسروں کی آمدنی کے ذرائع پیدا کرنے کے لیے ملک میں رائج قوانین کو پریشانیوں کے اسباب میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔"

"اچھا، تعلیم یافتہ لوگوں کو تو ابتدائی تعلیم کے دنوں میں ہی یہ سکھایا جاتا ہے کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے، ناانصافی کرنا بڑا گناہ ہے۔" جمیلہ خاتون نے کہا۔ "یہ باتیں غیر تعلیم یافتہ لوگوں کو تو یاد رہتی ہیں، لیکن پڑھے لکھے لوگ بھول کیسے جاتے ہیں؟"

"اس کی وجہ ہے۔" جہاد علی نے جواب دیا۔ "ابتدائی تعلیم کے دنوں میں یہ بھی پڑھایا جاتا ہے کہ پڑھو گے لکھو گے، بنو گے نواب جو کھیلو گے، کودو گے ہو گے خراب، لکھنا پڑھنا کرے وہی، گاڑی گھوڑا چڑھے وہی، گاڑی گھوڑے کا اپنا وجود ہے۔ اس کی الگ شان ہے، اور اس کے اندر بڑی کشش بھی ہے، لکھنا پڑھنا جتنا بڑھتا ہے، گاڑی گھوڑے کی کشش بھی اتنی ہی بڑھتی ہے۔ لیکن گناہ کا تو کوئی وجود نہیں ہے۔ اس کی کوئی شان و شوکت بھی نہیں ہے جسے دیکھ کر لوگ خوف کھائیں گے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کا کوئی لگاؤ بھی نہیں ہے۔ کوئی تال میل نہیں ہے۔ اس لیے گناہ کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں کوئی خیال جنم ہی نہیں لیتا۔ لہٰذا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد گاڑی گھوڑے کے نشے میں چُور ہو کر وہ لوگ ناانصافی کرنے میں بھی کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتے۔ جب حلال کی کمائی سے گاڑی گھوڑے کی سہولت فراہم نہ ہوتی ہو تو حرام کی کمائی کمانے کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے۔ ملک کے قوانین کو پریشانی کے اسباب میں تبدیل کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں۔"

یوں تو جہاد علی نے سمجھانے کے لیے جمیلہ خاتون کو بہت ساری باتیں کہہ دیں۔ لیکن اس کے ذہن میں پانی کی قیمت کا سوال بڑی دیر سے گردش کر رہا تھا۔ اگر پانی کا بل کمرشیل ریٹ سے ادا کیا جائے تو پھر گھی کی قیمت اور پانی کی قیمت میں کیا فرق رہ جائے گا؟ جہاد علی جیسے روزانہ کام کاج کر کے کھانے والے انسان کے لیے اتنی قیمت برداشت کرنا کیا ممکن ہوگا؟

جہاد علی نے اب تک کوئی دفتر نہیں دیکھا تھا۔ حالات سے مجبور ہو کر ایک دن اُسے دفتر آنا ہی پڑا۔ لیکن یہاں آ کر وہ بڑی مشکلوں میں پڑ گیا تھا۔ کہاں جائے، کس سے رجوع کرے، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہاں پر بے شمار دفاتر تھے اور ان دفتروں کا منظر اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ زندہ پیر کے مزار پر آ گیا ہو۔ ان دفتروں میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے کلرک اُسے مزار کے خادموں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سبھی زیارت کے لیے آنے والوں کو یوں ڈرا دھمکا رہے تھے جیسے پیر صاحب کا خوف دلا رہے ہوں۔ زیارت کے لیے آنے والے لوگ، جی حضور، جی حضور کہہ کر ہتھیلی کھجلا رہے تھے اور گانٹھ سے رقم نکال نکال کر کسی کے بائیں اور کسی کے دائیں ہاتھ میں دے رہے تھے۔

ایک دفتر کے بعد دوسرا دفتر تھا۔ خزانہ وصول کرنے کا دفتر تھا، ٹیکس وصول کرنے کا دفتر تھا، رجسٹری کا دفتر تھا، پرمٹ جاری کرنے کا دفتر تھا اور ان سارے دفاتر میں لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ کہیں پر ایک فارم حاصل کرنے کے لیے بہت سارے لوگ ہاٹ میں لائے ہوئے قربانی کے جانوروں کی طرح لائن میں کھڑے تھے اور چپراسی، اب نہیں ہوگا، اب نہیں ہوگا کہہ کر رحمدلی دکھاتے ہوئے بڑی مشکلوں سے کسی کو ایک اور کسی کو دو فارم یوں دے رہے تھے جیسے دل ہی دل میں دُور ہوا بھاگے کہہ کر انھیں بھگا رہے ہوں۔ کہیں پر کوئی امیدوار فارم کی خانہ پُری نہیں کر پا رہا تھا، ٹاؤٹ قسم کے لوگ اس سے فارم کی خانہ پُری کے لیے مول تول کر رہے تھے۔ کہیں فارم کی خانہ پُری میں غلطیاں نکال کر کلرک درخواست کنندہ کو ڈانٹ رہا تھا اور دو چار نوٹ مل جانے پر ہمدردانہ لہجہ میں غلطیاں سدھار لینے کا مشورہ دے رہا تھا۔

قریب ہی ایک اور دفتر تھا۔ جہاں قطاروں میں اسٹامپ فروخت کرنے والے بیٹھے تھے۔ شور و غل کی آواز سن کر جہاد علی نے ذرا سا گردن اونچی کر کے اس طرف دیکھا۔ اتنے میں ایک آدمی بولا۔ "تین روپے کا اسٹامپ پانچ روپے میں فروخت ہوتا ہے، یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

دوسرے آدمی نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے پہلی بار رجسٹری آفس میں آیا ہے۔"

جہاد علی ہمت کر کے ایک دفتر کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے پر ایک تختی جھول رہی تھی، جس میں "ٹریژری افسر"

لکھا ہوا تھا۔ جہاد علی اب تک کلرکوں کے سلوک سے بڑا دل برداشتہ ہو چکا تھا، اس لیے اس نے سوچا کیوں نہ براہ راست افسر سے ہی بات کی جائے۔ یہ سوچ کر اس نے دروازہ کا پردہ اُٹھا کر اندر جھانکا۔

افسر کے چہرے پر ڈاڑھی اور سر پر جالی دار ٹوپی تھی۔ وہ صاحب ٹیلیفون پر آپریٹر سے کوئی نمبر دریافت کر رہے تھے۔ ان کے سامنے دو خوش شکل موکل بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک نے التجا آمیز لہجہ میں کہا۔ "دیکھئے سر میں دفتر چھوڑ کر آیا ہوں۔ آپ مجھے ٹیلیفون گائڈ دے دیں، میں نمبر دیکھ کر باہر سے کسی ٹیلیفون پر باتیں کر کے آجاتا ہوں۔"

افسر نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "لیکن بھائی صاحب! گائڈ بک میں کیا آپ کو نمبر ملے گا؟ ہر سال نمبر بدل جاتا ہے اور گائڈ بک پانچ سال پرانا ہے۔ اب تو ہم لوگ محکوم نہیں رہے کہ ہر کام وقت پر کرنا ہی پڑے گا؟ آزادی سے قبل بدلتے ہوئے چھ موسموں کی طرح ہر چھ ماہ میں ایک گائڈ بک چھپ کر میز پر آجاتا تھا۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ چھ سال میں ایک گائڈ بک چھاپ کر ہم لوگ بڑے مسرت کے ساتھ رسم اجراء کی تقریب مناتے ہیں۔ پیغامات اور تقریریں اخباروں میں چھواتے ہیں، جیسے ہم نے روم کی سلطنت فتح کر لی ہو۔ آزادی سے قبل بھی ہمیں لوگ کام کرتے تھے اب بھی ہمیں لوگ کام کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہی کام پہلے ہم دوسروں کی تابعداری میں کرتے تھے اب آزادی کے ساتھ خود کرتے ہیں۔"

اس کمرے میں دوسری طرف دروازہ کی طرف منہ کیے ہوئے ایک بڑی سی میز سامنے رکھے ہوئے ایک مونچھ والا افسر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ شاید وہ ماتحت افسر تھا۔ دروازہ کے سامنے ایک چپراسی بیٹھا ہوا تھا جہاد علی نے اس سے کمرشیل ریٹ کے افسر کا پتہ پوچھا تو اس نے جہاد علی کو یوں دیکھا جیسے وہ پیسے ڈال کر بات کرنے والا ٹیلیفون ہو، پیسے ڈالے بغیر ڈائل ٹون نہیں آتا ہو۔

اغل بغل میں اور بھی کئی ٹیکس وصول کرنے والے دفاتر تھے۔ سبھوں کی ایک جیسی حالت تھی۔ قطار اور قطار، جدھر دیکھئے لوگ قطاروں میں کھڑے تھے۔ دکاندار اپنی دکانیں چھوڑ کر آئے تھے، ماسٹر اسکول چھوڑ کر آئے تھے، افسر اپنا دفتر چھوڑ کر آئے تھے اور یہ سلسلہ بہت دنوں سے چل رہا تھا۔ کہیں کہیں پر یکایک فارم ختم ہو جا رہا تھا۔ دربان کا اعلان فضا میں گونج رہا تھا، کہیں پر چپراسی قریب کے پان دکان کی طرف آنکھ سے اشارہ کر رہا تھا۔ جو عقلمند لوگ تھے وہ مفت تقسیم ہونے والا فارم پانچ دس روپے میں پان کی دکان سے حاصل کر لے رہے تھے اور جو بے وقوف لوگ تھے، آنکھ کا اشارہ نہیں سمجھتے تھے یا تو پھر گانٹھ کی رقم خرچ کر کے فارم لینا نہیں چاہتے تھے۔ وہ دن پر دن چکر لگاتے رہتے۔ قطاروں میں کھڑے ہوتے اور فارم ختم ہونے کا اعلان سن کر گھر واپس چلے جاتے اور انھیں دیکھ کر دربان اور چپراسی دھیرے سے مسکرا دیتا۔

یہ سب کچھ دیکھ کر جہاد علی گھر واپس آگیا۔ اس نے توبہ کر لی کہ پھر وہ ان دفتروں کا کبھی چکر نہیں لگائے گا۔ ختنہ بھی نہیں کرے گا۔ کاروبار ختم کر دے گا، مگر گھی کی قیمت میں پانی نہیں خریدے گا۔

لیکن جہاد علی کے دفتر نہ جانے سے کیا ہوتا تھا۔ اس کے معنی یہ تو نہ تھے کہ ان دفتروں کے چپراسی بھی جہاد علی کے یہاں نہیں آئیں گے؟ ایک روز واسا کے دفتر سے کچھ لوگوں نے آکر جہاد علی کے یہاں ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ چونکہ جہاد علی کمرشیل ریٹ سے پانی کا بل ادا کرنے سے انکاری تھا، اس لیے وہ لوگ اس کے پانی کی لائن کاٹنے آئے تھے۔

جہاد علی انھیں بار بار سمجھا رہا تھا کہ وہ اب ختنہ کرنے کا کاروبار نہیں کرتا، اب ختنہ کا موسم بھی نہیں تھا۔ اس لیے کمرشیل ریٹ سے پانی کا بل ادا کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر کار وہ لوگ اس دن واپس چلے گئے لیکن دوسرے ہی دن پھر آکر حاضر ہو گئے۔ اس بار جہاد علی کے نام تین ہزار روپے کا ایک بقایا کمرشیل بل لے کر آگئے تھے۔ سرکاری دفتر کے چپراسی اور پیادوں

کے شور وغل سے جہاد علی کا گھر گلزار ہوگیا تھا۔ نوٹس کا مضمون پڑھ کر جہاد علی اپنی صفائی میں رونی صورت بنا بیٹھا۔ ایک وقت کھانے کے بعد جسے دوسرے وقت کے کھانے کے لیے سوچنا پڑتا ہو، وہ تین ہزار کی رقم کہاں سے لائے گا؟ جہاد علی بے حد پریشان ہو اٹھا۔

جمیلہ خاتون نے ایک بار "نیل درپن" ڈرامہ دیکھا تھا۔ شوہر کی حالت دیکھ کر اس کی نگاہوں کے سامنے "نیل درپن" ڈرامہ کا منظر گردش کرنے لگا۔ نیل کی کھیتی کرنے والے صاحبوں کے ہاتھوں میں چابک دیکھ کر اس ملک کے کسانوں کے چہرے پر جس طرح خوف وہراس کی لکیریں اُبھر آتی تھیں آج اسی طرح سرکاری عملے کے ہاتھوں لائے ہوئے نوٹس کو دیکھ کر اس کے شوہر جہاد علی کے چہرے پر خوف وہراس کی لکیریں ابھر آئی تھیں جمیلہ خاتون شوہر کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہوگئی۔

جہاد علی کے گھر کے ایک طرف چنو میاں کا مکان تھا اور دوسری جانب شرافت میاں رہتے تھے۔ دونوں ہی تعلیم یافتہ، جہاندیدہ اور کاروباری تھے۔ محلہ کے سارے لوگ انھیں چچا کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور گاہے گاہے سبھی ان سے مشورہ طلب کرتے تھے۔ وہ بھی ہمیشہ اپنے نیک مشوروں سے لوگوں کو نوازتے رہتے تھے۔ اس لیے جمیلہ خاتون کو شریف چچا کی مدد لینے کے سوا کوئی دوسری راہ نظر نہ آئی وہ تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی ان کے گھر کی طرف چل پڑی۔

لیکن شرافت چچا کے یہاں پہنچتے ہی اس نے دیکھا کہ وہاں بھی ایک ہنگامہ برپا تھا۔ بلدیہ کے لوگ ان کے یہاں قرقی کا پروانہ لے کر آئے ہوئے تھے اور شور وغل مچا رہے تھے۔ شرافت چچا نے ان کے کہنے کے مطابق سات سال پہلے ایک سال کا بلدیہ ٹیکس ادا نہیں کیا تھا۔ شرافت چچا سات سال پرانی ایک رسید ہاتھ میں لیے ہوئے ان سبھوں کو دکھا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ انھوں نے ٹیکس ادا کر دیا تھا ان کے ذمہ کوئی ٹیکس باقی نہیں ہے۔ وہ بڑے دکھ کے ساتھ اپنی صفائی بیان کر رہے تھے اگر میں نے ٹیکس ادا نہیں کیا تھا تو پھر اس کی ادائیگی کا پروانہ سات سال بعد کیوں آیا ہے؟ ٹیکس ادا نہ کرنے پر اگر قرقی کا پروانہ جاری ہوسکتا ہے تو سات سال تک اس کی ادائیگی کا نوٹس نہ دینے پر بلدیہ کے عملہ کے نام پھانسی کا پروانہ کیوں جاری نہیں ہوسکتا؟ شرافت چچا کے ہاتھ میں اور بھی دو قرقی کے پروانے تھے۔ وہ اسے دکھاتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ اس سے پہلے بھی دو بار اسی طرح کی قرقی کا پروانہ جاری ہوا تھا۔ دونوں بار وہ دفتر جاکر ٹیکس کی ادائیگی کی رسید دکھا آئے تھے۔ دونوں ہی مرتبہ ان سے کہا گیا تھا کہ قرقی کا پروانہ ان کے نام غلطی سے جاری ہوگیا ہے۔ آئندہ ایسا نہ ہوگا۔ لیکن اس کے بعد بھی بقایا ٹیکس کی ادائیگی کے لیے چار مرتبہ ان کے نام نوٹس آچکا ہے اور وہ چار بار دفتر جاکر بقایا ٹیکس کی ادائیگی کے اس دعوی کی تصحیح کر آئے ہیں پھر اب یہ قرقی کا پروانہ کیسا ہے؟

"ارے صاحب! اگر آپ نے ٹیکس ادا کر دیا ہے اور یہ بات سچ بھی ہے، تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب بلدیہ کے لیجر میں اس کی وصولی درج نہیں ہے تو اس حقیقت سے آپ کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟" بلدیہ کے ایک عملہ نے شرافت چچا کے قریب آکر کہا۔

شرافت چچا نے اس آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی بے چارگی سے کہا... "جب میں آپ کے دفتر جاکر ٹیکس ادا کر سکتا ہوں، تو کہہ دیا ہوتا، لیجر میں درج بھی کر دیتا!"

درمیان میں ایک تیسرا آدمی بول اٹھا... "ارے بھائی صاحب! اب تو آپ نے اپنے گیس بجلی اور پانی کا بل بھی خود ہی تیار کر کے ادا کرتے ہیں، ایک دن وہ بھی آئے گا جب بلدیہ کا عملہ لیجر کھولے ہوئے خاموش بیٹھا رہے گا اور آپ کو بل کی ادائیگی کے بعد لیجر میں اس کا اندراج بھی خود ہی کرنا ہوگا، ورنہ قیامت تک اس کی ادائیگی کے لیے نوٹس آتا رہے گا!"

"سنیے بھائی صاحب سنیے!" بلدیہ کے ایک عملہ نے شرافت چچا کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا... "یہ رسید لے کر آپ زندگی بھر بھاگ دوڑ کرتے رہیں گے تو بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا سمجھے؟ مال پانی خرچ کیے بغیر لیجر میں اس کا اندراج کیسے ہوگا؟"

حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے جمیلہ خاتون کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ شرافت چچا کے پاس جائے۔ وہ وہاں سے اپنے دوسرے پڑوسی چنومیاں کے گھر کی طرف چل پڑی۔

وہ چنومیاں کے یہاں پہنچی تو وہاں بھی ایک ہنگامہ برپا تھا۔ کچھ دنوں قبل بارہ سال کے بعد ان کے نام زمین کے ٹیکس کی بابت سات ہزار روپے کا ایک ڈیمانڈ نوٹس آیا تھا جس کی شرط تھی کہ اگر سات دنوں کے اندر مذکورہ رقم ادا نہ کی گئی تو جرمانہ سمیت ادا کرنا ہوگا نوٹس میں رقم بھی غلط درج تھی، چار ہزار کی جگہ سات ہزار کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ چنومیاں نوٹس کی تصحیح کرانے کے لیے دفتر گئے تھے۔ لیکن عملہ صاحب زمیندار ہرے کرشن سنگھ کی طرح پھنکارتے ہوئے بولا... "نوٹس میں جو رقم درج ہے وہ ٹھیک ہے۔"

جب وہ بڑے صاحب سے جا کر ملے تو انھوں نے چھوٹے صاحب کے پاس بھیج دیا چھوٹے صاحب براہ راست بڑے صاحب سے ملنے پر ناراض ہو کر بولے... "نوٹس کے مطابق ہی روپیہ جمع دینا ہوگا، اگر کچھ کہنا ہو تو بعد میں درخواست دے کر اپنا مدعا بیان کرنا۔"

چنومیاں کو بہت دکھ ہوا گئے دنوں کے زمیندار بھلے مانس ہوا کرتے تھے وہ فرش پر بیٹھتے تھے، حقہ پیتے تھے، دھیان سے ساری باتیں سنتے تھے اور بھول چوک ہوتی تو اس کی تصحیح کر دیتے۔ ہنس کر باتیں کرتے لیکن آج کے زمیندار پردے کے پیچھے میز اور کرسی لے کر بیٹھتے ہیں، ایک دو بات کہتے ہی گوکھرو سانپ کی طرح پھن جوڑ کر پھنکارنے لگتے ہیں۔

چنومیاں بے حد پریشان ہو اُٹھے، اتنا سارا روپیہ سات دن میں کہاں سے آئے گا؟

بہت سوچ بچار کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ٹیلیویژن فروخت کر دیں گے۔ پھر انھوں نے ایک دن اخبار میں اشتہار دے دیا۔

"ایک استعمال شدہ ٹیلیویژن برائے فروخت، درج ذیل پتے پر رجوع کریں۔"

اشتہار کا شائع ہونا تھا کہ ٹی وی کے محکمہ سے چنومیاں کے نام ایک نوٹس آگیا تھا۔

"اخبار میں شائع شدہ اشتہار سے پتہ چلا ہے کہ آپ ایک استعمال شدہ ٹی وی فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کے پاس اس ٹی وی کا لائسنس ہے؟ اگر آپ نے لائسنس لیا ہوا ہے تو لائسنس کی تفصیل منسلک فارم میں بھر کر دفتر میں داخل کریں۔ اگر لائسنس نہیں لیا ہو تو ٹی وی کی خریداری کی رسید اور ضروری کاغذات کے ساتھ دستخط کنندہ کے دفتر میں آکر فوراً لائسنس جاری کرنے کے لیے عرضی پیش کریں۔ آپ لائسنس حاصل کرنے کے بعد ہی ٹی وی فروخت کر سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ ٹی وی فروخت کرنے کے بعد خریدار کا نام و پتہ لکھ کر ضرور بھجوائیں۔"

چنوں میاں نے غصہ سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے نوٹس کا مضمون اس طرح پڑھا جیسے وہ قاضی نذرالاسلام کی نظم "غریب" تحت میں پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ وہ گزشتہ دس سال سے ٹی وی استعمال کر رہے تھے۔ ہر سال لائسنس کی تجدید کراتے تھے اس کی خبر آج تک کسی نے نہیں لی۔ لیکن اب اس کے فروخت کرنے کا اشتہار دیکھ کر محکمہ ٹی وی کیوں اتنا پریشان ہو گیا تھا۔ چنومیاں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا نوٹس کے مضمون سے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت دنوں پہلے بہشت سے کوئی ٹی وی چوری ہو گیا ہو اور اخبار

کے اشتہار سے اب اس کا پتہ چلا ہو؟

چنو میاں کے گاؤں سے ان کے ایک رشتہ دار آئے ہوئے تھے۔ نوٹس کا مضمون پڑھ کر بولے... "بیٹے چنو، تم لوگ ہمیشہ گاؤں والوں کو بدنام کرتے رہتے ہو کہتے ہو گاؤں کے لوگ ٹھگ ہوتے ہیں، چور اچکے ہوتے ہیں، دھوکہ باز ہوتے ہیں۔ لیکن تم نے کبھی سوچا، گاؤں میں چور اُچکے کون ہیں؟ یہ وہی لوگ ہیں جو غیر تعلیم یافتہ اور جاہل ہیں۔ جن کے اندر تعلیم کی بو باس نہیں ہے، جن کے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے، روزی روزگار نہیں ہے، وہی لوگ پیٹ بھرنے کے لیے چوری کرتے ہیں، لوگوں کو ٹھگتے ہیں، دھوکہ دیتے ہیں، مگر تمھارے شہر میں کیا ہو رہا ہے، جو لوگ تعلیم یافتہ ہیں، پڑھے لکھے ہیں، اچھی نوکری کرتے ہیں، اچھی تنخواہ پاتے ہیں، مگر کام نہیں کرتے۔ یہ لوگ دفتروں میں بیٹھے بیٹھے چالاکی سے فریب دے کر لوگوں کی گانٹھ سے رقم نکال لیتے ہیں، کیا یہ لوگ چور اُچکے نہیں ہیں؟ ان سے تو چور اُچکے ہی بھلے، ان کے پاس ایک عذر ہے، مجبوری ہے، وہ لوگ جاہل ہیں، پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے چوری کرتے ہیں، وہ لوگ رات میں لوگوں سے چھپ کر چوری کرتے ہیں، اگر کوئی دیکھ لے تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن تمھارے یہ تعلیم یافتہ، پڑھے لکھے لوگ سب کچھ دن کے اجالے میں کرتے ہیں، کھلے عام سینہ تان کر، دھمکی دے کر لوٹتے ہیں۔ جب بھی کوئی ہائی جیکر گرفتار ہوتا ہے تو دیکھا جاتا ہے کہ وہ کسی تعلیم یافتہ باپ کا پڑھا لکھا لڑکا ہوتا ہے، رشوت کے الزام میں کوئی گرفتار ہوتا ہے تو دیکھا جاتا ہے کہ وہ کسی بڑے دفتر میں بڑا عملہ ہوتا ہے، نہیں بابا نہیں، ہمارے گاؤں میں بھی چور اُچکے پکڑے جاتے ہیں، مگر وہ سب غریب بے سہارا، بھوکے ننگے لوگ ہوتے ہیں، جو بھوک کی شدت سے تنگ آکر چوری کرتے ہیں، تمھارے شہروں کی طرح فریج، ٹی وی اور ۵۵۵ کے لیے چوری نہیں کرتے!"

جمیلہ خاتون نے جب یہ حال دیکھا تو چنو میاں سے ملے بغیر ہی گھر واپس آگئی۔

گھر واپس آکر اس نے پس انداز کی ہوئی رقم نکال کر نوٹس لانے والے چپراسیوں اور پیادوں کو سلامی دے کر ان کا جی خوش کر دیا اور وہ لوگ واپس چلے گئے اور تب اُسے خیال آیا کہ اگر یہ تدبیر وہ پہلے کرتی تو کرنسی ریٹ سے بل بھی نہ آتا، بے عزتی بھی نہ ہوتی:

اُسے اپنی بے وقوفی پر رونا آگیا۔

پنجابی زبان و ادب

(ایک جائزہ)

مصنف: حمید اللہ شاہ ہاشمی

قیمت: ۵۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

پیٹر شیٹ / منیر الدین احمد
(جرمن نظمیں)

امن کا کھیل

بچے صحن میں
جنگ کھیل رہے تھے
وہ اپنی جنگ
بے پناہ شور شرابے سے کھیل رہے تھے

میں نے اُنھیں کھڑکی میں سے
پکار کر کہا
امن کا کھیل کھیلو!
مجھے اُمید تھی کہ اس طرح
وہ کم شور مچائیں گے

بچے صحن میں
بے حد خوش ہوئے
آؤ ہم امن کا کھیل کھیلیں!
انھوں نے جیسے ایک منہ
سے پکار کر کہا

اور سوچنے لگے کہ
امن کا کھیل کیسے کھیلا جائے

سوچتے رہے اور پھر
ایک دوسرے کے گلے پڑنے لگے
تب ایک تین بالشت قد والا بچہ
میری کھڑکی کی سمت رخ کر کے چلایا
چچا، امن کیسے کھیلا جاتا ہے؟

میں اعتراف کرتا ہوں کہ
مجھے بچے کے سوال پر کوئی
جواب نہ سوجھا، اس لیے
میں یہ سوال
آگے تم سے کر رہا ہوں
امن کیسے کھیلا جاتا ہے

باولی / ترجمہ خلد سہیل

عورت کا انتقام

میرا خاوند
مدت ہوئی
گھر سے جا چکا ہے
لیکن میں
جب بھی گاؤں جاتی ہوں
اور دور سے
کسی پہاڑی یا درخت کو دیکھتی ہوں
تو یوں لگتا ہے کہ
وہ میرا خاوند ہے

برناڈ ڈاڈی / ترجمہ خلد سہیل

اے خُدا تیرا شکر ہے

اے خُدا تیرا شکر ہے
کہ تو نے مجھے کالا پیدا کیا
میں ساری دُنیا کے دکھ اپنے کندھوں پر لیے
لیے پھرتا ہوں
اے خُدا تیرا شکر ہے
سفید رنگ صرف خاص موقعوں کے لیے ہوتا
ہے
لیکن
کالا رنگ ہر موقع اور ہر دن کا رنگ ہے
میں زندگی کی پہلی شام سے
ساری دُنیا کا بوجھ اپنے شانوں پر لیے پھر رہا
ہوں
میں کالی رات میں اتنے قہقہے لگاتا ہوں
کہ وہ صبح کا رُوپ اختیار کر لیتی ہے
اے خدا تیرا شکر ہے
کہ تو نے مجھے کالا پیدا کیا

رفتار ادب

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

سیرت احمد مجتبیٰؐ - قباء سے واقعہ افک تک

سیرت نگار: شاہ مصباح الدین شکیل

صفحات: ۵۵۲

ناشر: پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی لیمٹڈ،

سائز: ۳۶×۲۳ صفحات ۵۵۲

سیرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پی ایس او نے مجلے اور کتابیں شائع کرنے کا جو سلسلہ کافی عرصے سے جاری کر رکھا ہے کتاب زیر تبصرہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب سیرت احمد مجتبیٰؐ کا دوسرا حصہ ہے اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قباء میں آمد سے واقعہ افک تک کے تقریباً تمام واقعات بیان کیے گئے ہیں اور اس کو ترتیب دینے میں سابقہ روایت کو قائم رکھا گیا ہے۔ کسی شاعر کے اس مصرع کے پیش نظر "لطیف بود حکایت دراز تر گفتم" واقعات سیرت کو بیان کرنے میں نہایت فرح و بسط سے کام لیا گیا ہے۔ اصل میں سیرت طیبہ کا مطالعہ محض تاریخی واقعات جاننے کے لیے ہی نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "قُل اِن کُنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ" (اے رسول کریم کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا) پر عمل پیرا ہونے کے لیے سیرت کو معیار عمل بنانا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک حضور سرور کائناتؐ کی سیرت طیبہ کی پوری تفصیلات و جزئیات کا ہمیں علم نہیں ہوگا ہم کیسے آپؐ کا اتباع کر سکیں گے۔

کتاب زیر تبصرہ میں ویسے تو تمام امور ہی کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے لیکن بعض واقعات کو بیان کرنے میں اس کا خاص اہتمام کیا گیا ہے مثلاً ہجرت کے موقع پر قباء سے یثرب جاتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محلہ بنو سالم کی مسجد میں جمعہ کا جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اور وہ پہلے جمعہ کا پہلا خطبہ تھا، دوسری کتابوں میں یا تو اس کا صرف حوالہ ملتا ہے یا نامکمل خطبہ دیکھنے میں آتا ہے جب کہ کتاب زیر تبصرہ میں یہ پورا خطبہ نہایت دلنشیں انداز میں دیا گیا ہے۔ کاش اب بھی ہر مسجد میں اور ہر جمعہ کو صرف یہی خطبہ معہ ترجمہ کے پڑھا جایا کرے تاکہ تمام نمازی ہفتہ بھر معاملات دنیوی میں ڈوبے رہنے کے بعد اپنے ایمان کو تازہ کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و کبریائی کا کچھ احساس کر سکیں اور روح اسلامی سے واقف ہو سکیں۔

اس طرح کے اور بھی کئی مواقع ہیں جہاں مرتبِ کتاب نے تفصیلات دے کر سیرت طیبہ کے مقصد کو واضح کیا ہے۔ لیکن ان محاسن کے ساتھ ساتھ بعض باتیں ایسی بھی ہیں جو بری طرح کھٹکتی ہیں مثلاً سیرت نگار نے قباء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے

قیام کی مدت صفحہ ۲۲ پر مورخین کے حوالے سے چار دن یعنی پیر، منگل، بدھ اور جمعرات بتا کر جمعہ کو یثرب کے لیے روانگی دکھائی ہے اور اسی کے ساتھ حضرت انسؓ بن مالک کے حوالے نے امام بخاری کی روایت کے مطابق یہ مدت ۱۴ دن قرار دی ہے۔ اس اختلاف کے ظاہر کرنے میں تو کوئی حرج نہیں تھا لیکن صفحہ ۲۹ پر فیصلہ کن انداز میں یہ فقرہ لکھ دیا ہے۔ "قباء میں چودہ دن قیام فرمانے کے بعد جمعہ کو دن چڑھے رسول اللہ یثرب روانہ ہوئے۔"

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خود سیرت نگار نے صفحہ ۲ پر نہایت صراحت کے ساتھ یہ تحریر کر دیا ہے کہ حضورؐ ۸ ربیع الاول ۱۴ نبوت کو پیر کے دن قباء پہنچے اور ۱۲ ربیع الاول کو جمعہ کے دن محلہ بنی سالم میں جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد یثرب میں داخل ہوئے تو پھر ۱۴ دن کے قیام کو کس بنیاد پر صحیح مان لیا گیا جب کہ حساب لگا کر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ۸ ربیع الاول بروز پیر سے ۱۴ دن بعد اتوار ہوگا نہ کہ جمعہ اگر قیام کی مدت ۴ دن مان لی جائے تو پھر کوئی الجھن باقی نہیں رہتی۔

بہرحال ایک بلند پایہ کتاب میں اس طرح کے سہو بری طرح کھٹکتے ہیں۔ اس لیے اُن کی نشاندہی کر دی گئی ہے ورنہ مجموعی طور پر سیرت طیبہ پر یہ ایک اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہے۔ واقعات کی تفصیلات اور تلاش و جستجو، انداز بیان کی دلکشی اور اثر پذیری، کتاب کا ظاہری حسن وہ چیزیں ہیں جن کی صحیح داد دینے کا بھی تبصرہ نگار خود کو اہل نہیں سمجھتا۔ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم جیسے مقدس موضوع کے سلسلے میں پی ایس او نے جو کام کیا ہے وہ اس کے حسنات میں شامل کیے جانے کے قابل ہے اور اپنے اس حسن عمل کی بدولت خود کمپنی اور واجب الاحترام سیرت نگار دونوں اللہ تعالیٰ سے بڑے اجر جزیل کے مستحق ہیں۔

(ثناء الحق صدیقی)

مرضیات (تاریخ اشاعت: ۱۹۹۱ء)

صفحات: ۲۶۴ قیمت ۴۵ روپے

پتا: بیت الحکمت، ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی

کتاب "مرضیات" بیت الحکمت نے شائع کی ہے جو ایک علمی و سائنسی ادارہ ہے۔ ہمدرد اپنی طبی و سائنسی اور علمی کتب کی اشاعت کے لیے محتاج تعارف نہیں اور نہ ہی کتاب "مرضیات" کے مؤلف جناب حکیم نعیم الدین زبیری صاحب محتاج تعارف ہیں۔ انھوں نے متعدد طبی اور علمی موضوعات پر تصانیف، مقالات و تراجم پیش کیے ہیں۔ فاضل مؤلف کی یہ کتاب طبی نقطۂ نگاہ سے خاص اہمیت رکھتی ہے، کیوں کہ یہ طبی نصاب کو زمانۂ حال کی ضروریات سے ہم آہنگ کرنے اور ایک مزوج و متحد قومی نظام طب و علاج کی ترویج کی جانب ایک اہم قدم ہے۔

"مرضیات" نصاب طب میں شامل علم الامراض کے تمام جدید موضوعات پر مشتمل ایک جامع، مکمل مگر مختصر اور معیاری کتاب ہے جس میں اردو اصطلاحات کے ساتھ ساتھ انگریزی مترادفات بھی درج ہیں۔ نیز اصطلاحات پر ضروری اعراب بھی لگائے گئے ہیں تاکہ طلبہ ان کا درست تلفظ کر سکیں۔ سادہ اور رنگین تصاویر کے ذریعے نہ صرف علمی ضروریات کو پورا کیا گیا ہے بلکہ اسے خوبصورت بھی بنایا گیا ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اگرچہ طبی کالجوں کے طلبہ کے لیے تصنیف کی گئی ہے لیکن اس سے دیگر نظام طب مثلاً ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی کے طلبہ بھی استفادہ کر سکتے ہیں نیز ایک عام پڑھا لکھا شخص بھی اپنے علمی ذوق کو پورا کرنے کے لیے اس کتاب سے استفادہ کر سکتا ہے۔

کتاب کا سرِ ورق رنگین، خوبصورت اور پائیدار ہے۔

مقدمہ کشمیر

مصنف: بختیار احمد

صفحات: ۱۱۱ قیمت ۶۰ روپے

مکتبہ اتحاد، ۴۱۴۴، ارم ہومز بلاک ۱۱، گلشن اقبال، کراچی

"مقدمہ کشمیر" ایک بڑا گھمبیر موضوع تھا۔ اس کی پیشکش تحقیق، سند، ثبوت اور دماغ سوزی چاہتی تھی۔ اس ڈرامے کو پہلے ٹیوی اسکرین پر دیکھنے اور بعد ازاں کتابی شکل میں اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصنف بختیار احمد ان دشوار مراحل سے کامیاب گزر گئے ہیں۔

"مقدمہ کشمیر" کی ڈراما ٹائیریشن تکنک کے اعتبار سے دوسرے کھیلوں سے مختلف ہے، اس کو پیش کرتے ہوئے روایتی اندازِ پیشکش سے انحراف کیا گیا ہے، تحریر و پیشکش میں روایت سے بغاوت کا حوصلہ وہی کر سکتا ہے جو ڈرامے کے فن اور اُس کی کنہیات پر نظر رکھتا ہو، بختیار احمد کے متعلق اس بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں وہ ایک زیرک پروڈیوسر ہیں اور لچ بھرا ذہن رکھتے ہیں۔ کھیل لکھنا کھیل کھیلنا اور کھیل پیش کرنا اُن کے فریضے میں شامل ہے اور صبح سے شام تک اُن کا وقت اسی تگ و دو میں گزرتا ہے۔

کتاب کا سرِ ورق طارق جمیل کے فکر کا نتیجہ ہے "مقدمہ کشمیر" کشمیر کے موضوع پر اچھا خاصا مواد اور دستاویز فراہم کرتی ہے۔

(ا.....س)

اِدراک

شفیق احمد شفیق

صفحات: ۱۳۶۔ قیمت ۵۰ روپے

حلقہ آہنگ نو۔ ڈی۔ ئی ۷۸/۱۸ سمن آباد،

فیڈرل بی ایریا، کراچی

"ادراک" جناب شفیق احمد شفیق کی پہلی تنقیدی کتاب ہے۔ اس میں جو مضامین شامل ہیں وہ مختلف شخصیات کے آئینے دکھاتے ہیں ان کی چھوٹ لازماً ان شخصیات کی ادبی خدمات پر بھی پڑتی ہے، اس طرح شخصی اذکار کے توسط سے ادبی مسائل بھی زیر بحث آتے ہیں۔ دراصل ادیب، ادب اور ادبی تخلیقات ایک مثلث کی تین شاخیں ہیں، کسی مجموعی ادبی تاثر کو حاصل کرنے کے لیے ان تینوں کا کسی ایک مرکز پر یکجا ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر مثلث سے مطلوبہ تاثر حاصل نہیں ہو سکتا۔

ادراک میں جو سب سے اچھی بات دیکھنے میں آئی وہ یہ ہے کہ اس میں شامل مضامین تالیف (COMPILATION) کے زمرے میں نہیں آتے، ان کے سیاق و سباق میں مصنف اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے کہیں کہیں فکر کی لہر بھی کارفرما نظر آتی ہے اور فکر کی اساس چوں کہ زندگی کی مثبت قدروں پر ہے اس لیے اس کی سربراہی میں کسی نکتے کو بیان کرتے ہوئے شفیق احمد کا ذہن تذبذب میں نہیں۔

کتاب دیدہ زیب ہے، عنوان مضامین کے مزاج کے عین مطابق ہے اور خوب ہے۔

(ا.....س)

راگ کی آگ

شوکت واسطی

صفحات: ۱۲۹، قیمت ۵۵ روپے

واسطی پرائیویٹ لیمٹڈ، ۱۱ شان پلازا،

بلیو ایریا، اسلام آباد

تراجم کسی زبان و ادب کے دامن کو وسیع تر کرنے میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ تراجم کے ذریعے ایک زبان سے دوسری زبان میں نہ صرف نئے نئے موضوعات داخل ہوتے ہیں بلکہ ان موضوعات کو برتنے کے طور طریقے اور اسلوب سے بھی آشنائی ہوتی ہے ظاہر ہے دوسری زبانوں تک رسائی کا ذریعہ تراجم ہی ہیں۔

جناب شوکت واسطی ایک عرصے سے تراجم کے کام میں منہمک ہیں، یہ کام انھوں نے اشتیاق کی سطح پر قبول کیا ہے، وہ ڈانٹے کی ڈیوائن کامیڈی کے تینوں حصے کا ترجمہ حزنیہ، کربیہ اور طربیہ کے نام سے کر کے کتابی شکل میں چھاپ چکے ہیں۔ اس طرح کا ادبی کام دقت طلب ہے، ہر شخص کے بس کی بات نہیں شوکت واسطی نے اس طرح کا ایک اور کارنامہ ہومر کے "ایلیڈ" کے چھے دفتروں کے منظوم ترجمے کر کے کیا ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی انھوں نے کرسٹوفر مارلو کے ڈرامے "دی ٹریجک آف فاؤسٹ" کا منظوم و مقفیٰ ترجمہ بھی کیا ہے۔ ایسی ہی نوعیت کا ایک اہم کام "راگ کی آگ" ہے۔ جو آنجہانی رابندر ناتھ ٹیگور کی نوبل انعام یافتہ تصنیف "گیتانجلی" کا ترجمہ ہے۔

"گیتانجلی" کا پہلا اردو ترجمہ آج سے برسوں پہلے "عرض نغمہ" کے عنوان سے علامہ نیاز فتح پوری نے کیا تھا۔ بعد ازاں "گل نغمہ" کے نام سے معروف شاعر عبدالعزیز خالد نے کیا۔ اب اس نظم کا ترجمہ "راگ کی آگ" کے نام سے شوکت واسطی صاحب نے پیش کیا ہے۔ کیا بہتر ہوتا کہ اس کا نام "عرض نغمہ" اور "گل نغمہ" کی مناسبت سے "نذر نغمہ" رکھا جاتا "راگ کی آگ" بھی خوبصورت نام ہے۔ ترجمے کے باب میں شوکت صاحب کا ذہن منجھ سا گیا ہے لہٰذا ترجمہ صاف شفاف ہوتا ہے۔

(ا.....س)

منظر اداس ہے

حفیظ اثر

صفحات: ۱۶۰، قیمت ۴۰ روپے

الفردوس۔ ۱۴۷۔ جناح آباد ٹاؤن،

ایبٹ آباد، ہزارہ

"منظر اداس ہے" حفیظ اثر کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے "آب، سراب" شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اس کی رسائی بہ قول حفیظ صاحب عام ہاتھوں تک نہیں ہو سکی۔ اور اس کی تقسیم خلوص دوستاں کی نذر ہو گئی۔ یہ خلوص دوستاں بھی بعض وقت

اذیت کا سبب بنتا ہے۔

حفیظ اثر کی زیر تبصرہ کتاب کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

میرے لیے یہ فیصلہ کرنا محال ہے
منظر اداس ہے کہ شعور نظر نہیں

منظر اداس ہونے کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن شعور نظر کے نہ ہونے کی بات قابل اعتنا نہیں، پوری کتاب شروع سے آخر تک جناب حفیظ اثر کے شعور نظر کا منہ بولتا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ اس طرح کے اشعار کوئی ایسا ہی شاعر کہہ سکتا ہے، جس کا شعور نظر بالیدہ و زمانہ چشیدہ ہو۔

کتنے مقتل ہیں سرِ راہ گزار
منزلِ شوق کی دارائی تک

کس سے احوالِ شبِ ہجر کہیں گے جاکر
جو شناسا تھے، غم دہر سے دوچار ملے

گم کردۂ منزل کی اثر آس نہ ٹوٹے
بیٹھا ہوں سرِ راہ گزر دیپ جلائے

کتاب اچھی چھپی ہوئی ہے اور مطالعے کی دعوت دیتی ہے۔

(ا.....س)

لیکھ

تاج سعید
صفحات: ۸۰، قیمت ۴۰ روپے
مکتبہ ارژنگ، پوسٹ بکس ۳۲۳، پشاور

"لیکھ" تاج سعید کی "ہندکو" شاعری پر مبنی کتاب ہے اور عجب نہیں کہ اپنے سلسلے کی یہ پہلی کتاب شمار ہو۔ تاج سعید کی ہندکو شاعری کو پڑھ کر اس زبان کی بابت جو محسوس ہوا وہ یہ کہ یہ زبان اردو اور پنجابی سے زیادہ قریب ہے اور پشتو کے مقابلے میں غیر پشتو دان کو ہندکو سہل معلوم ہوتی ہے۔ ہندکو کا رواج خاص طور پر شہر پشاور میں ہے، میں وثوق کے ساتھ اس زبان کی پیدائش کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ باور کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کسی زمانے میں پشاور کاروباری مراکز اور باہر سے مال لانے لے جانے والوں کی گزرگاہ بھی تھا اگر ان کے کارواں کا پڑاؤ بھی ممکن ہے ہندکو انھیں اداوار کی پیداوار ہو۔

تاج سعید اردو گیت نگار اور شاعر کے طور پر ادبی حلقے میں خاصے جانے پہچانے جاتے ہیں ان کی مدیرانہ حیثیت بھی تسلیم شدہ ہے۔ "سوچ سمندر" کے نام سے ان کے اردو کلام کا مجموعہ ۱۹۷۸ء میں آچکا ہے۔ ان کی تازہ تصنیف "لیکھ" غزلوں، نغموں اور

کافیوں کا مجموعہ ہے۔ کافی پاکستان کے ہر علاقے کی مقبول صنف ہے۔ اس صنف کو صوفیوں نے شغف سے برتا ہے۔

تاج سعید نے "ہند کو" میں شاعری کر کے اس زبان کی پسندیدگی کا جواز فراہم کیا ہے۔ کتاب اچھی چھپی ہے۔ اس مختصر مجموعے میں نعت، منقبت اور ملی نغمے سبھی کچھ ہے۔

حقی کا ایک نادر شعری کارنامہ

قہر عشق

شیکسپیئر کے شہرہ آفاق ڈرامے انطنی کلوبطرہ کا منظوم و مقفّٰی ترجمہ

صفحہ بہ صفحہ اصل انگریزی متن کے ساتھ

یہ شیکسپیئر کے سب سے طویل رومانی ڈرامے کا اردو روپ ہے جس میں سیاست سے لے کر محبت تک اور بری و بحری جنگوں سے لے کر عشرت گاہوں کی رنگینیوں تک دلچسپ اور مسحور کن واقعات و سانحات کی ایک دنیا سمائی ہوئی ہے۔ کلوبطرہ کا منفرد کردار اور اس کے مختلف روپ کہ وہ عورت بھی ہے ملکہ بھی، سیاست میں الجھی ہوئی اور دام محبت میں بھی گرفتار۔ اُس کی طنازی، طرّاری، چہلیں، رنگ رلیاں، خواصوں اور شاگرد پیشہ کی آپس کی چھیڑ چھاڑ اور پھر اس تمام افسانے کا حسرتناک انجام جو ملکہ کی خودکشی پر ہوا۔ کلوپطرہ کے آخری لمحات کی دل گداز تصویر، غرض ایک بے مثل ادبی کارنامہ ہے، زبان و بیان کی خوبیوں سے مالا مال، کہیں زور خطابت ہے تو کہیں روزمرہ کا لطف اور کسی ایک سطر پر بھی ترجمے کا گمان نہیں ہوتا۔ اسی بناء پر میاں بشیر احمد مرحوم نے بھرے جلسے میں کہا تھا کہ معلوم ہوتا ہے اصل یہ ہے اور ترجمہ شیکسپیئر نے کیا تھا۔ حقی صاحب کے بقول یہ اردو اسالیب کی ایک آزمائش تھی۔ اردو اس میں کس طرح پوری اتری ہر پڑھنے والا اس کی گواہی دے گا۔

انجمن ترقی اردو نے مترجم کے اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے رنگین باتصویر سرِورق کے ساتھ اہتمام سے عمدہ کاغذ پر شائع کیا۔ قیمت: ۷ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

گرد و پیش

صبا اکبر آبادی کی وفات پر انجمن ترقی اردو پاکستان میں تعزیتی جلسہ

اردو کے مشہور شاعر حضرت صبا اکبر آبادی کی وفات پر انجمن ترقی اردو پاکستان کے دفتر میں ایک تعزیتی جلسہ ۲ نومبر ۱۹۹۱ء کو منعقد ہوا جس میں مقررین نے صبا اکبر آبادی کے فکر و فن اور اُردو کی بیش بہا ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر ڈاکٹر اسلم فرخی، شہزاد منظر، ادیب سہیل اور ڈاکٹر وفا راشدی نے مرحوم صبا اکبر آبادی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ بعد ازاں مرحوم کی مغفرت کے لیے فاتحہ خوانی کی گئی۔

بیاد عصمت چغتائی

جمعرات ۴ نومبر ۱۹۹۱ء کو پریس کلب ادبی کمیٹی کی طرف سے محترمہ عصمت چغتائی کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت ہاجرہ مسرور نے کی۔ بھارت کی مشہور افسانہ نگار جیلانی بانو مہمانِ خصوصی تھیں۔

جلسے کی نظامت سرور جاوید نے کی، انھوں نے عصمت چغتائی کی جرأت اظہار کا ذکر کیا اور نامور طنز و مزاح نگار مشتاق یوسفی کا یہ قول دہرایا "عصمت نے مردوں کو جرأت اظہار بخشا ہے۔"

اس موقع پر جن اصحاب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ان میں حسن عابدی، عظیم بیگ چغتائی کے صاحبزادے علیم بیگ چغتائی، محمد علی صدیقی، جیلانی بانو، پروفیسر ممتاز حسین اور صدر جلسہ ہاجرہ مسرور کے نام نامی شامل ہیں۔

علیم بیگ چغتائی نے کہا کہ عصمت چغتائی بہت کچھ تھیں، لیکن سب سے پہلے وہ انسان تھیں اُن کے مزاج میں ایک قسم کی بے نیازی تھی، دنیا بھر کے ادبی ایوارڈز اور تحفے و تحائف ملے، لیکن ان کی بے نیازی اور انکساری میں کوئی فرق نہ آیا۔

محمد علی صدیقی نے کہا کہ عصمت آپا نے اُس وقت آنکھیں کھولیں جب ڈپٹی نذیر احمد موجود تھے اُن کا ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونا ایک فاصلہ پیدا کر گیا ہے، اب آسانی سے اس افسانہ نگار کے بڑا پا کا اندازہ کیا جا سکے گا۔

جیلانی بانوں نے ایک تاثراتی مضمون "تھوڑی سی پاگل" پڑھا جو عصمت آپا سے اُن کی بھرپور محبت اور اپنائیت کا اظہار تھا۔ انھوں نے کہا کہ عصمت آپا نے دنیا کو عورت کی نظر سے دیکھنے کا شعور دیا۔

پروفیسر ممتاز حسین نے کہا کہ عصمت چغتائی یوں تو بنیادی طور پر افسانہ نگاری کے فن سے وابستہ تھیں اور تذکرے میں سعادت حسن منٹو کے برابر ان کا نام آتا رہا لیک عصمت نے دو بہت اچھے خاکے بھی لکھے، ایک اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی اور دوسرے مجاز لکھنوی پر۔

صدر جلسہ ہاجرہ مسرور نے اس موقع پر ایک مختصر سا مضمون پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ معاشرے میں عورتوں کے لیے ایک لکشمن ریکھا کھنچی ہوئی ہے جو خواتین اس لکیر کو پار کرتے ہوئے خوف کھاتی تھیں اور ایسا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی، حجاب امتیاز علی اس خوف کی لکیر پر چڑھ کر کھڑی ہو گئیں اس سے ڈاکٹر رشید جہاں کو "انگارے" والے ہنگامے کو سہارنے کی جرأت ملی اور عصمت چغتائی کے لحاف تک آتے آتے اردو ادب میں ایک دھماکہ ہوا لیکن یہ لحاف تو نظیر اکبر آبادی بہت پہلے اُٹھا چکے تھے۔

جیلانی بانو کے ساتھ ایک شام

۸ نومبر ۱۹۹۱ء کی شام "جیلانی بانو کے ساتھ ایک شام" کی تقریب کونسل ہال بلدیہ کراچی وسطی ناظم آباد میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب کا اہتمام ادارہ طلوع افکار"، اور فکشن گروپ نے بلدیہ کے تعاون سے کیا تھا۔

جلسے کی صدارت جناب شان الحق حقی نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض پروفیسر علی حیدر ملک نے انجام دیے نظامت کے دوران انھوں نے جستہ جستہ محترمہ جیلانی بانو کے فن و شخصیت پر اظہار خیال کیا جس سے حاضرین جلسہ کو جیلانی بانو کے متعلق کئی نئی باتیں جاننے کا موقع ملا۔

پروفیسر ممتاز احمد خان نے جیلانی بانوں کے ناول "ایوانِ غزل" (۱۹۷۶ء) کے حوالے سے مقالہ پڑھا۔ انھوں نے کہا حیدر آباد دکن کے زوال آمادہ معاشرے پر عزیز احمد کی ایسی بلندی اور ایسی پسی پہلا ناول" ہے۔ لیکن "ایوانِ غزل" اُس سے کہیں زیادہ وسیع تناظر رکھتا ہے۔

مظہر جمیل نے اپنے مقالے میں کہا کہ جیلانی بانو نے پانچویں دہائی کے سالوں میں اپنی شناخت قائم کر لی تھی انھوں نے زندگی کے تنوعات کو پیش نظر رکھا محض جنسی و نفسیاتی افسانے نہیں لکھے انھوں نے دکنی تہذیب، جاگیردارانہ نظام کا PARADOX اور تلنگانہ تحریک سے اپنے لیے موضوعات منتخب کیے ان کی تخلیقات سیاسی شعور سے ہم آہنگ تو ہیں لیکن انھوں نے اپنی تحریر کو سیاسی ہرکارہ بننے نہیں دیا۔

زاہدہ حنا نے ایک مختصر سا شخصی مضمون پڑھا اور انکشاف کیا کہ جیلانی بانو افسانہ نگار بننے سے پہلے شاعرہ تھیں اور تخلص صبا بانو بدایونی کیا کرتی تھیں زاہدہ حنا نے کہا کہ جیلانی بانو کے افسانوں میں دنیا اپنی تمام تر چاشنیوں اور خوبصورتیوں کے ساتھ موجود ہے۔ دکن سے ان کی ایک معاصر واجدہ تبسم بھی تیز تیز ابھریں لیکن جلد ہی ان کا رخ بازار کی طرف مڑ گیا۔ جب واجدہ شجر ممنوعہ کو

پال پوس رہی تھیں تو جیلانی بانو روشنی کا مینار بنی ہوئی تھیں۔

پروفیسر عتیق احمد نے اپنے مقالے میں کہا کہ جیلانی بانو کا پہلا افسانہ "موم کی مریم" ادب لطیف لاہور ۱۹۵۲ء میں چھپا تھا، اور موصوفہ کا یہی افسانہ اُن کی شہرت کا سنگِ میل ثابت ہوا۔ عتیق صاحب نے فرداً فرداً اُن کے کئی اہم افسانوں پر گفتگو کی اور کہا کہ اُن کے بیشتر افسانوں پر تلنگانہ تحریک کا اثر ہے۔

پروفیسر ممتاز حسین نے جیلانی بانو پر گفتگو کرنے کی بجائے اُن کے شوہر نامدار ڈاکٹر انور معظم کی ادبی شخصیت پر کی جو ان کے ہم پہلو مجلس صدارت میں رونق افروز تھے۔

جیلانی بانو جب بولنے کے لیے کھڑی ہوئیں تو پتا چلا کہ وہ بولنے کے کام کی نہیں اُن کا اصل میدان لکھنا ہے۔ اس "آئیڈیل جوڑے" کو موسیقی سے گہری دلچسپی ہے، محترمہ جیلانی بانو جب پاکستان آئیں تو کسی نہ کسی بڑے موسیقار سے ملاقات کے لیے موقع نکالا، پچھلے دونوں سفر میں جیلانی بانو ملکہ ترنم نورجہاں اور مہدی حسن کے گھر جا کر ملیں اور اس سفر میں کراچی آنے پر اُن کے شریکِ سفر انور معظم کو عابدہ پروین کے کیسٹ کی تلاش ہوئی۔

اس موقع پر ڈاکٹر انور معظم کو بھی اظہار خیال کی دعوت دی گئی وہ مائیک کے سامنے آئے اور گفتگو میں بذلہ سنجی کا ثبوت دیا، انھوں نے کہا یہ موقع ہمارے لیے بڑا EMBARRASSING ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود مجھے بانو کے بارے میں یہاں بہت سی باتیں معلوم ہوئیں اور بڑا رشک آیا کہ ہم سے زیادہ یہاں والے جانتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ گھر میں بھی میرا اور بانو کا سامنا کم کم ہی ہوتا ہے، ہم دونوں اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ بانو مجھ پر بے حد اعتماد کرتی ہیں اس لیے میں اُن کے فن پر رائے دینے سے کتراتا ہوں، کہیں وہ میری بری رائے کو بھی اچھا سمجھ کر اُس پر اعتماد نہ کر لیں۔ ایک اور بات یہ کہ ہندوستان کے لوگوں کو سمجھنے میں پاکستان آکر بڑی مدد ملتی ہے۔

صدر جلسہ ڈاکٹر شان الحق حقی نے کہا کہ جیلانی بانو کی معصومیت اور انکسار اُن کے افسانوں میں ایک الہامی کیفیت پیدا کرتی ہے جیلانی بانو اور اُن کے شریک سفر ڈاکٹر انور معظم ایک آئیڈیل جوڑے ہیں۔ دونوں کی اپنی شناخت ہے، ڈاکٹر انور معظم نے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے بہ طور موضوع جمال الدین افغانی کا انتخاب کیا۔ اسلامیات، اسلامی کلچر و مذہب پر اُن کی گہری نظر ہے۔

لاہور میں بین الاقوامی اردو کانفرنس کا انعقاد
اخراجات حکومت برداشت کرے گی

لاہور: اداکار محمد علی نے وزیراعظم پاکستان سے ملاقات کے بعد گزشتہ روز ایک پریس کانفرنس میں بتایا کہ لاہور میں بین الاقوامی اردو کانفرنس کے انعقاد کے بارے میں بات کی تھی جس کو وزیراعظم نے اصولی طور پر تسلیم کر لیا ہے یہ بین الاقوامی اردو کانفرنس فروری ۹۲ء میں ہوگی اس میں دنیا بھر سے اردو کے شعراء، ادیب اور دانشور شرکت کریں گے اس کے تمام اخراجات حکومت برداشت کرے گی اور وزیراعظم اس کانفرنس کے ایک سیشن کی صدارت کریں گے۔ اس کانفرنس کے انعقاد کا مقصد اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے کام کرنا ہے۔

وفاقی اور صوبائی حکومتیں اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے نافذ کریں

وفاقی اور صوبائی حکومتیں فوری طور پر "نفاذ اردو بل" منظور کر کے ملک میں اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے نافذ کریں یہ

مطالبہ جماعت اسلامی ضلع لاہور کے اجتماع میں منظور کردہ ایک قرارداد میں کیا گیا۔ چوہدری احمد خاں کی پیش کردہ یہ قرارداد اتفاق رائے سے منظور کی گئی جس میں کہا گیا ہے کہ آئین پاکستان کی دفعہ ۲۵۱ (۱) کے مطابق ۱۴، اگست ۱۹۸۸ء تک غیر ملکی زبان انگریزی کی جگہ قومی زبان اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت سے نافذ ہوجانا چاہیے تھا مگر مدت پوری ہو جانے کے باوجود یہ آئینی تقاضا پورا نہیں کیا گیا۔ اس لیے وفاقی اور صوبائی حکومتوں سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ "نفاذ اردو بل" فوری طور پر منظور کیا جائے اور ملک کے تمام سرکاری، نیم سرکاری اور نجی اداروں میں اردو زبان کو رائج کیا جائے۔

سول ججوں اور مجسٹریٹوں کو فیصلے اردو میں لکھنے کا پابند بنایا جائے گا

حکومت نے عدالتی نظام میں تبدیلیوں کی غرض سے بعض اہم اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ عدالتی زبان کے طور پر اردو کو ترجیح دی جائے گی۔ ابتداء میں سول ججوں اور درجہ اول اور دوم کے مسجٹریٹوں کو عدالتی کارروائی وعدالتی فیصلے اردو میں تحریر کرنے کا پابند بنایا جائے گا تاکہ نیم خواندہ افراد بھی عدالتی معاملات اور فیصلوں سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ وزیراعظم نواز شریف نے وزارت عدل و پارلیمانی امور کو حال ہی میں ہدایت کی ہے کہ قومی اسمبلی کے آئندہ اجلاس سے قبل عدالتی نظام میں تبدیلیوں کے لیے قابل عمل سفارشات پر مبنی مفصل رپورٹ انھیں بھیجی جائے۔

سمینار میں وارث شاہ کی اردو شناسی دریافت کی گئی

پنجاب آرٹس کونسل کے تحت منعقدہ وارث شاہ سیمینار میں ڈاکٹر انور سدید کا موضوع "وارث شاہ کی اردو شناسی" تھا۔ وہ تاریخ اردو ادب سے وارث شاہ کی ایک اردو غزل تلاش کر لائے اور اس کے سیاق وسباق میں شاہ حسین، بلھے شاہ اور سلطان باہو کی پنجابی شاعری میں اردو کے آہنگ اور رنگ کا ذکر کیا، ان کے خیال میں وارث شاہ کی غزل کا رنگ ایرانی ہے لیکن اس کا آہنگ پنجابی ہے اور یہ ہند آریائی تہذیب کے اس سنگم کی مظہر ہے جس پر اردو زبان نے نجم لیا۔ انھوں نے وارث شاہ کی پنجابی شاعری کو بے پناہ خراج عقیدت پیش کیا لیکن اس بات کی داد بھی دی کہ ان کی اردو غزل ارتقائے زبان کی ایک گمشدہ کڑی اور ان کی اردو شناسی کا عمدہ نمونہ ہے۔

مشرف احمد کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری

افسانہ نگار مشرف احمد کو ان کے تحقیقی مقالے "اردو انشائیے کی روایت اور میر ناصر علی" پر کراچی یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند تفویض کی گئی۔ انھوں نے یہ مقالہ ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی کی رہنمائی میں مکمل کیا۔

مضمون ارسال کرتے وقت اپنا مکمل پتا ضرور تحریر فرمائیں

ڈاکٹر وفا راشدی

نئے خزانے

مطالعہ کتب

آفتاب اقبال شمیم	گفتار ایک مطالعہ	دائرے، کراچی دسمبر ۹۰ء	ص ۸۶
ادیب سہیل	شادی خانہ آبادی مطبوعہ	جرنل، پٹنہ ۵۴/۵۵/۹۰ء	ص ۳۱۲
اطہر سلیم	نظم جدید کی کروٹیں (۱)	ماہ نو، لاہور اگست ۹۰ء	ص ۹۲
افتخار اجمل شاہین	عکس خیال (۲)	صریر، کراچی ستمبر ۹۰ء	ص ۷۵
افسر ماہ پوری	اوراق ہستی، انجم شادانی کی شعری کہکشاں	سب رس، کراچی اکتوبر ۹۰ء	ص ۲۸
انور سدید، ڈاکٹر	کچھ وقت پاکستانی کتب کے ساتھ (۳)	کتاب نما، دہلی جنوری ۹۰ء	ص ۹۰
" " " "	کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ (۴)	قومی زبان، کراچی جولائی ۹۰ء	ص ۷۷
" " " "	" " " " " " " " (۵)	" " " " اگست ۹۰ء	ص ۷۳
" " " "	" " " " " " " " (۶)	" " " " اکتوبر ۹۰ء	ص ۷۹
" " " "	" " " " " " " " (۷)	" " " " نومبر ۹۰ء	ص ۷۸
	خواب رو (۸)	اوراق، لاہور دسمبر ۹۰ء	ص ۳۳۱
جگن ناتھ آزاد، پروفیسر	بمبئی کی بزم آرائیاں (۹)	طلوع افکار، کراچی دسمبر ۹۰ء	ص ۹۶
حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر	ڈاکٹر وفا راشدی کا ایک تحقیقی کارنامہ، مہران نقش	انشاء، کلکتہ اکتوبر ۹۰ء	ص ۹۰
خالد وہاب	آوارگی، محمد عمر میمن کے منتخب تراجم کا ایک جائزہ	قومی زبان، کراچی اکتوبر ۹۰ء	ص ۵۱
خامہ بگوش	آئینہ کیوں نہ دوں / اطہر حسن صدیقی	دائرے، کراچی اگست ۹۰ء	ص ۶۶
راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر	جمع و خرج وفا (۱۰)	طلوع افکار، کراچی نومبر ۹۰ء	ص ۶۹
ریاض صدیقی	قصہ موسم موسم کا (۱۱)	" " " " " " "	ص ۷۳
ساجد اللہ تفہیمی، ڈاکٹر	مناقب الصوفیہ تالیف عبادی پر ایک نظر، قسط ۳	آگہی، کراچی اگست ۹۰ء	ص ۳۸
سجاد نقوی	عشق سے طبیعت نے (۱۲)	اوراق، لاہور اگست ۹۰ء	ص ۵۳۴
سعادت سعید، ڈاکٹر	ریشمی حسیت اور کھردرے شعور کا سرکار اما (۱۳)	ادب لطیف، لاہور جولائی ۹۰ء	ص ۷۹
سلطان رشک	ابن الوقت / ڈپٹی نذیر احمد	نیرنگ خیال، راولپنڈی جولائی ۹۰ء	ص ۲۵
سلیم الرحمن	مٹی کا دیا (۱۴)	ماہ نو، لاہور جولائی ۹۰ء	ص ۳
سید ضمیر جعفری	تذکرہ حجاز / بریگیڈیر گلزار احمد	ادب لطیف، لاہور ستمبر ۹۰ء	ص ۹۶
سید معراج جامی	اوراق ہستی (۱۵)	طلوع افکار، کراچی اکتوبر ۹۰ء	ص ۸۳
شفیق احمد شفیق	مٹی کی خوشبو کی کہانی (۱۶)	صریر، کراچی، اگست ۹۰ء	ص ۷۸
شمیم احمد	مندر میں محراب / اجمل نیازی	دائرے، کراچی اگست ۹۰ء	ص ۷۰

شہرت بخاری، پروفیسر	شب زاد (۱۷)	ادب لطیف، لاہور جولائی ۹۰ء	ص ۷۵
ضمیر الدین احمد عرش گیاوی	حیاتِ مومن (۱۸)	نگار، کراچی اگست ۹۰ء	ص ۷ تا ۶۴
طاہر تونسوی، ڈاکٹر	کرن کاجل/تاب عرفانی	دائرے، کراچی ۹۰ء	ص ۷۹
ع ۔ ع	فتاویٰ تاتار خانیہ (۱۹) (جز اول تا چہارم)	معارف، اعظم گڑھ نومبر ۹۰ء	ص ۳۹۰
عبدالقوی دسنوی، پروفیسر	آنکھوں دیکھی (۲۰)	اوراق، لاہور اگست ۹۰ء	ص ۵۳۳
فہیم اعظمی، ڈاکٹر	تفہیم غالب (۲۱) ایک تجزیہ	صریر کراچی، اکتوبر ۹۰ء	ص ۷۵
" " "	موسم یا انسانی زندگی کا استعارہ	" " دسمبر ۹۰ء	ص ۷۵
قمر رئیس، ڈاکٹر	نئی نظمیں/اشفاق حسین	طلوع افکار، کراچی جولائی اگست ۹۰ء	ص ۵۷
کلیم سہسرامی، ڈاکٹر	نوید مسیحا/علیم صبا نویدی	دائرے، کراچی اگست ۹۰ء	ص ۴۷
مجاہد لکھنوی	بیسویں صدی کی لڑکی (۲۲)	طلوع افکار، کراچی اکتوبر ۹۰ء	ص ۸۲
ممتاز احمد خان	گنگا جمنی ۔؟۔ ناول یا خود نوشت	" " دسمبر ۹۰ء	ص ۴۳
منظر علی خان	نسیم جاں سخن	اوراق، لاہور دسمبر ۹۰ء	ص ۳۲۰
میرزا ادیب	تحقیق اور تلاش/ڈاکٹر معین الرحمٰن	ماہ نو، لاہور ستمبر ۹۰ء	ص ۹۲
نظیر صدیقی	ابن انشا، احوال و آثار (۲۳)	آگہی، کراچی دسمبر ۹۰ء	ص ۹۹
وزیر آغا، ڈاکٹر	سلمیٰ کے تعاقب میں (۲۴)	ماہ نو، لاہور اگست ۹۰ء	ص ۸۹
" " "	علی اختر کی "دھوپ میں لکیریں" (۲۵)	اوراق، لاہور دسمبر ۹۰ء	ص ۳۳۵
وفا راشدی، ڈاکٹر	مولانا محمد علی جوہر حیات اور تعلیمی نظریات ایک مطالعہ ۲۶	العلم، کراچی جولائی ستمبر ۹۰ء	ص ۴۷
" " "	امیران تالپور کے علمی کارنامے (۲۷)	" " " اکتوبر/دسمبر ۹۰ء	ص ۱۱۱
" " "	گھائے رنگ رنگ، ایک مطالعہ	دائرے، کراچی اکتوبر/نومبر ۹۰ء	ص ۹۳
یعقوب عمر، ڈاکٹر	نذرِ مختار ایک نظر	کتاب نما، دہلی، جنوری ۹۰ء	ص ۴۱

تعلیمی و تدریسی مسائل و مباحث

آسیہ بیگم	سیماپوری اور اس کے نواح میں اردو تعلیم کے مسائل	ہماری زبان، دہلی، ۱۵ اکتوبر ۹۰ء	ص ۳
احمد سجاد، ڈاکٹر	مدارس اسلامیہ کے نصابِ تعلیم میں تبدیلی کیوں؟	العلم، کراچی، جولائی/ستمبر ۹۰ء	ص ۱۸
اسماعیل سعد، ڈاکٹر	طلبہ میں تشدد کے رجحانات	آگہی، کراچی، ستمبر ۹۰ء	ص ۷۱
حبیب الرحمٰن خان شیروانی	مسلمانوں کی قدیم تعلیم کا نصب العین	العلم، کراچی، اکتوبر ۹۰ء	ص ۲۶
سید تحسین حیدر رضوی	اردو تعلیم کے مسائل: نوی سطح پر	ہماری زبان، دہلی، ۱۵ ستمبر ۹۰ء	ص ۱
قاضی محمد عدیل عباسی	صوبہ یوپی بھارت میں اردو کی تعلیم	العلم، کراچی، اکتوبر/دسمبر ۹۰ء	ص ۶۲
محمد خلیل احمد	اردو طلبہ کے لیے غیر نصابی کتابوں کا مسئلہ	ہماری زبان، دہلی، ۲۲ اکتوبر ۹۰ء	ص ۸
مصطفےٰ علی بریلوی	ذریعہ تعلیم اور بلوچستان	العلم، کراچی، جولائی/ستمبر ۹۰ء	ص ۵
معین اختر انصاری	مشرقی دہلی میں اردو کی پرائمری تعلیم، ایک جائزہ	ہماری زبان، دہلی، ۲۲ اکتوبر ۹۰ء	ص ۳
وارث سرہندی	اردو ذریعہ تعلیم	ہماری زبان، دہلی، ۱۵، ستمبر ۹۰ء	ص ۲

علمی، ادبی، تعلیمی، ثقافتی ادارے اور تحریکیں

الہلال رپورٹ	شمالی امریکہ کی ادبی اور سماجی سرگرمیاں	قومی زبان، کراچی، دسمبر ۹۰ء	ص ۷۹
جیلانی کامران	حلقہ اربابِ ذوق اور نئی نظم	ادب لطیف ۵۵ سالہ نمبر، ۹۰ء	ص ۵۱

حسن سوز	ترقی پسند تحریک فیض اور پاکستان	قومی زبان، کراچی، نومبر ۹۰ء	ص ۳۱
سروپ سنگھ، ڈاکٹر	خطبہ استقبالیہ، انجمن ترقی اردو ہند کے زیر اہتمام قرۃ العین حیدر کو "گیان پیٹھ" ایوارڈ ملنے پر جلسہ استقبالیہ	ہماری زبان، دہلی، یکم، نومبر ۹۰ء	ص ۱
محمد ایوب تاباں، ڈاکٹر	اردو کی ترقی میں اردو اکیڈمیوں کا رول	" " "	ص ۸
بیرالال چوپڑا، ڈاکٹر	ہریانہ میں اردو اکادمی کی ادبی سرگرمیاں	انشاء، کلکتہ، نومبر/دسمبر ۹۰ء	ص ۴۳

سیاست، صحافت امور مملکت

عبدالسلام ڈاکٹر/ترجمہ ڈاکٹر محمد رضا، پروفیسر محمد رفیع	نیوکلیائی تحفظ تخفیف اسلحہ اور ترقی	دائرے، کراچی، جولائی ۹۰ء	ص ۷
محمد ابوذر واجدی	اسلام اور قانون امن و صلح	آگہی، کراچی، دسمبر ۹۰ء	ص ۱۷
محمد احمد قادری، ڈاکٹر	اسلامی نظمیاتِ عامہ	" " "	ص ۶۰
محمد ضیاالحق شیخ	السیزان	آگہی، کراچی، ستمبر ۹۰ء	ص ۶۷

مضامین

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی

(تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ)

قیمت: ۶۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

"قومی زبان" کا زرِ سالانہ بصورت چیک انجمن ترقی اردو پاکستان کے نام ارسال کریں۔

حروف تازہ

کتابیں

دشت نظر سے آگے
افسانے

رشید امجد
صفحات: ۸۷۲ قیمت ۴۰۰ روپے
مقبول اکیڈمی، شاہراہ قائداعظم، لاہور

سجر ممنوعہ
افسانے

منیر الدین احمد
صفحات: ۲۵۶ قیمت ۲۵۰ روپے
مکتبہ ادبِ لطیف ۳۳- سی ۳، گلبرگ ۳، لاہور

ماضی کے تعاقب میں
خود نوشت

یونس احمر
صفحات: ۱۷۴ قیمت ۹۰ روپے
فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ اردو بازار کراچی

ابرِ کرم
شاعری

طالب جلال
صفحات: ۱۶۰ قیمت ۲۵ روپے
۱۰- اے بلاک، ایل، نارتھ ناظم آباد، کراچی

روشن دان میں چڑیا
شاعری

نسیم سحر
صفحات: ۱۲۰ قیمت ۶۰ روپے
پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۲۵- لوئر مال، لاہور

زرد ستارہ
افسانے

منیر الدین احمد
صفحات: ۱۸۴ قیمت ۱۰۰ روپے
فضلی برادرز ہمبرگ، جرمنی

شطرنج اور اس کے قوانین

عبدالحمید خاں
صفحات: ۲۹۴ قیمت ۶۰ روپے
شارق پرنٹ ہاؤس، ناظم آباد، کراچی

حدیث وطن
قومی نظمیں (دوسرا ایڈیشن)

محبت خان بنگش
صفحات: ۱۴۴ قیمت ۶۰ روپے
ادارہ علم و ادب پاکستان، کوہاٹ ڈویژن صوبہ سرحد

دہرے موسموں کا عذاب
افسانے

کوکب جمیل
صفحات: ۱۶۰ قیمت ۵۰ روپے
مکتبہ بھوپال پوسٹ بکس نمبر ۱۸۱۸۲
ناظم آباد، کراچی ۷۴۷۰۰

اطراف
شاعری

احمد صغیر صدیقی
صفحات: ۱۴۴ قیمت ۸۰ روپے
ایس۔ آر۔ پبلی کیشنز ۴۱، پریس چیمبرز۔
آئی آئی چندریگر رو، کراچی

مرضیات
طب

حکیم نعیم الدین زبیری
صفحات: ۲۶۴ قیمت ۴۵ روپے
بیت الحکمت، ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، کراچی

بچوں کے اسمٰعیل میرٹھی
نظموں کا مجموعہ

حکیم نعیم الدین زبیری
صفحات: ۲۲۷ قیمت ۲۵ روپے
نونہال ادب، ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی

مکالمات وزیر آغا
مکالمات

مرتبہ، ڈاکٹر انور سدید
صفحات: ۲۸۸ قیمت ۱۰۰ روپے
مکتبہ فکر و خیال، لاہور

جریدے

جرنل خدا بخش لائبریری ۵۷-۶۲

مرتب: عابد رضا بیدار
صفحات: ۲۴+۹۵۶ قیمت ۱۵۰ روپے
خدا بخش اورینٹیل پبلک لائبریری پٹنہ

ادبِ لطیف

چیف ایڈیٹر: صدیقہ بیگم
صفحات: ۱۸۰، قیمت ۱۰ روپے
۳۳ سی، ۲- گلبرگ- لاہور

فنون

احمد ندیم قاسمی
۳۹/۶- ملک چیمبر
نزد سیشن کورٹ، لوئر مال، لاہور

آج

مرتب: اجمل کمال
صفحات: ۲۳۴، قیمت ۴۰ روپے
مکتبہ دانیال وکٹوریہ چیمبرز نمبر ۲،
عبداللہ ہارون روڈ، کراچی ۳۶

مُفیض
(سہ ماہی اگست ۱۹۹۱ء

مرتب: محمد اقبال نجمی
صفحات: ۲۰۸، قیمت ۲۵ روپے
۱۰۸- بی سٹیلائٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ

نقد و نظر
(ششماہی)

مدیر اسلوب احمد انصاری
صفحات: ۱۳۶ قیمت ۳۰ روپے
گلستان، سول لائنز، دودھ پور، علی گڑھ
بھارت ۲۰۲۰۰۱

طلوعِ افکار

ادبیات
(سہ ماہی شمارہ ۱۶)

حسین انجم، مظہر جمیل
مسلم شمیم نکہت بریلوی
صفحات ۸۸، قیمت ۱۰ روپے
مکتبہ دانیال، کراچی وکٹوریہ چیمبر
۲ عبداللہ ہارون روڈ کراچی

مدیر اعلیٰ خالد اقبال یاسر
صفحات ۳۱۲ قیمت ۲۰ روپے
اکادمی ادبیاب پاکستان
سیکٹر H-۸/۷ اسلام آباد

پاکستان کی کہانی
دادی اماں کی زبانی

مصنفہ: سلمیٰ زمن
قیمت: ۱۵ روپے
انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

پاکستان میں اردو تحقیق
از

ڈاکٹر معین الدین عقیل
قیمت: ۳۰ روپے
انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ۔ کراچی نمبر ۱

Regd M. No. 270

Phone: 7724023

Monthly

QAUMI ZABAN

Karachi

انجمن کی مجوّزہ عمارت کا نقشہ

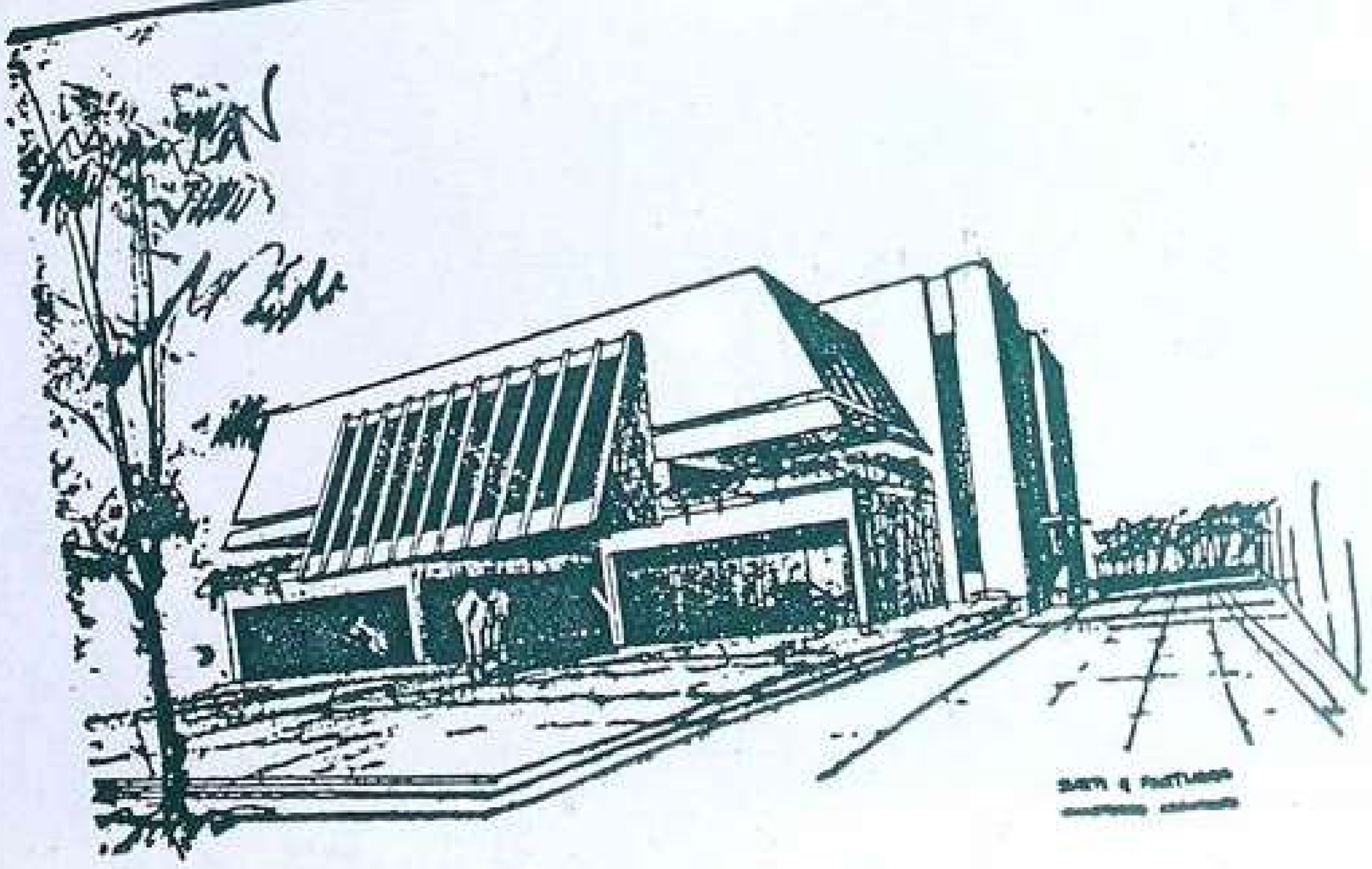

ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر: ادیب سہیل، طابع: مشہور آفسٹ پریس، مقامِ اشاعت: انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی نمبر ۱